کی عملی زندگی کے ذریعہ اس کو بدلنے کی کوشش کی، ان کی یہ کوشش آج بھی تہذیب الاخلاق کے صفحات میں موجود ہے، مصنف نے سرسید کی ان ہی کوششوں کی، ان کی تحریروں کی روشنی میں تفصیل کی ہے، کتاب میں کل نو باب ہیں، پہلے باب میں اسباب زوال پر گفتگو کی گئی ہے، دوسرے ابواب میں سرسید کی اصلاحی تحریریں نقل کی گئی ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ سرسید نے بعض مفید اصلاحیں بھی کیں، لیکن اسی کے ساتھ ان کی بہت سی تجدد پسندیاں جن کو اصلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے محض مغربی تہذیب کی تقلید اور مرعوبیت کا نتیجہ تھیں، ان میں سے بعض اصلاحیں ایسی ہیں جو اس زمانہ کے تجدد پسندوں میں بھی مضحکہ انگیز سمجھی جائیں گی، بہرحال کتاب محنت سے لکھی گئی ہے جس سے اس عہد کی اصلاحی کوششوں پر روشنی پڑتی ہے، اور اس حیثیت سے وہ مطالعہ کے لائق ہے۔

نسیم مغرب - از اے، سی، بہار، صفحات ۱۲۰ کتابت وطباعت اعلیٰ - ناشر: انجمن ترقی اردو علی گڑھ، قیمت :- ۶ر

"نسیم مغرب" انگریزی کے مشہور شعرا کے کلام کا منظوم ترجمہ ہے، کسی زبان کا دوسری زبان میں ترجمہ خود ہی ایک مشکل کام ہے اور پھر نظم کا نظم میں ترجمہ کرنے کی جرأت وہی کر سکتا ہے جس کو دونوں زبانوں پر پوری قدرت ہو، اصل نظموں کا مفہوم اس ترجمہ میں کہاں تک ادا ہوا ہے اس کا صحیح فیصلہ تو انگریزی ادب کے ماہرین ہی کر سکتے ہیں، مگر ترجمہ کی خوبی حسن ادا اور اس کی روانی و برجستگی کی داد بہرحال مترجم کو دینی پڑتی ہے، اس میں ۱۳ مشہور شعرا کی ۸۰ نظموں کے ترجمے پیش کیے گئے ہیں، اور ہر ترجمہ بجائے خود ایک نظم معلوم ہوتا ہے، آخر میں ان شعرا کے مختصر حالات اور ان کے کلام کی خصوصیات کا ذکر بھی مترجم نے کر دیا ہے، انگریزی کی ایک دو نظموں کے متفرق ترجمے تو اس سے پہلے بھی ہو چکے ہیں مگر تاریخی تدریج کے اعتبار سے اس طرح کی کوئی سنجیدہ کوشش اس سے پہلے نہیں ہوئی تھی، پروفیسر بہار اور انجمن ترقی اردو دونوں قابل تحسین ہیں کہ انھوں نے انگریزی ادب کے جواہر پاروں سے اردو کا دامن مالامال کرنے کی کوشش کی، نظموں کے انتخاب میں بھی بڑی حد تک حسن ذوق کا ثبوت دیا گیا ہے۔

"م - ج"

جلد ۹۵ - ماہ ذیقعدہ ۱۳۸۴ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۶۵ء - نمبر ۳

مضامین

شذرات

الحمد للہ جوبلی کی تقریب بخیر و خوبی اور نہایت کامیابی کے ساتھ ختم ہوگئی، لوگوں کا بیان ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے مسلمانوں کا ایسا منتخب اور نمایندہ اجتماع نہیں ہوا تھا، حکومت کے ارکان، اسلامی ملکوں کے سفراء، مشاہیر علماء، یونیورسٹیوں اور عربی درسگاہوں کے نمائندے، نامور اصحاب علم و قلم اور مسلمانوں کے مختلف مکاتب خیال کے اکابر شریک ہوئے، بیرونی ملکوں کے نمایندوں میں سعودی عرب کے سفیر محمد الحمد الشبیلی اور ان کے نائب، پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر افضل اقبال، والیان ریاست میں نواب ساجدہ سلطانہ صاحبہ نواب بیگم بھوپال، صوبائی حکومت کے ارکان میں شریمتی سوچیتا کرپلانی وزیر علیا، سید علی ظہیر وزیر قانون، سید مظفر حسین وزیر ٹرانسپورٹ، علما میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، قاری محمد طیب صاحب، مفتی عتیق الرحمن صاحب، مولانا سید محمد اسعد، مولانا منت اللہ رحمانی امیر شریعت بہار، مولانا ابو اللیث امیر جماعت اسلامی، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا محمد عمران خان ناظم دار العلوم تاج المساجد بھوپال، مولانا ابو العرفان مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء، مولانا محمد اویس نگرامی، مولانا تقی الدین امینی ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی، مولانا عبد السلام قدوائی ناظم شعبۂ دینیات جامعہ ملیہ، قاضی سجاد حسین صاحب صدر مدرس مدرسہ فتحپوری دہلی، مولانا بدر الدین صاحب اصلاحی ناظم مدرسۃ الاصلاح سرائمیر، مولانا شاہد فاخری، مولانا محمد رضا فرنگی محلی، مولانا شاہ عون احمد صاحب و شاہ عز الدین صاحب پھلواروی، مولانا محمد رابع استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء، یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور مشاہیر اصحاب علم و قلم میں مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی،

ڈاکٹر یوسف حسین خاں پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، پروفیسر محمد مجیب صاحب شیخ الجامعہ، ڈاکٹر عابد حسین مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی، ضیاء الحسن صاحب فاروقی پرنسپل جامعہ کالج، سعید انصاری صاحب استاد ٹریننگ کالج جامعہ، خلیق احمد صاحب نظامی ریڈر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی، اقبال انصاری صاحب استاد شعبۂ اسلامیات مسلم یونیورسٹی، سید حسن عسکری صاحب صدر شعبۂ تاریخ پٹنہ یونیورسٹی، ڈاکٹر امیر حسن زیدی ریڈر شعبۂ فارسی دلی یونیورسٹی، حافظ غلام مرتضیٰ صاحب استاد شعبۂ عربی الٰہ آباد یونیورسٹی، شبیر احمد خاں صاحب غوری رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش، مولانا سید ریاست علی صاحب استاد عربی و فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پٹنہ، سید نجیب اشرف صاحب ندوی ڈائرکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی، سید شہاب الدین دسنوی پرنسپل صابو صدیق ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ بمبئی مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی رام پور، مالک رام صاحب دہلی، پروفیسر رام کمار چوبے بنارس، حیات اللہ انصاری اڈیٹر قومی آواز، مولانا حامد الانصاری غازی، حکیم عبد القوی صاحب نائب مدیر صدق جدید محمد الحسنی اڈیٹر البعث الاسلامی و تعمیر حیات لکھنؤ، عبد اللطیف صاحب اعظمی جامعہ، عبد القوی دسنوی سیفیہ کالج بھوپال،

دوسرے ممتاز لوگوں میں کرنل بشیر حسن زیدی سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی، شیخ ظہور الحسن صاحب ریٹائرڈ سکریٹری حکومت اتر پردیش، قاضی عدیل صاحب عباسی ایڈوکیٹ بستی ان مخلصوں کے علاوہ اور بہت سے اصحاب ذوق اور قدردانوں نے شرکت فرمائی جن کی فہرست بہت طویل ہے، ان ناموں سے جوبلی کی کامیابی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جوبلی کے تین اجلاس ہوئے، افتتاحی اجلاس کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا، اسکے بعد مجلس دار المصنفین کے صدر ڈاکٹر سید محمود صاحب نے جلسہ کا افتتاح اور راقم الحروف نے دار المصنفین کی جانب سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا، اس کے جواب میں

ڈاکٹر صاحب نے اپنا بے مثل خطبہ پڑھا جو خیالات کی بلندی و گہرائی، قومی و ملی جذبات اور ادبی فصاحت و بلاغت کا شاہکار اور بقول مولانا سید ابوالحسن علی خطبوں کا تاج محل تھا۔ صدر کے شکریہ کے بعد یہ اجلاس ختم ہو گیا، اسی جلسہ میں عطیوں کا اعلان ہوا، اسی دن شب کو علمی مذاکرہ (سمپوزیم) کی مجلس ہوئی، اس میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں، مولانا قاری محمد طیب صاحب، سعودی عرب کے سفیر اور پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر نے تقریریں کیں، سعودی عرب کے سفیر کی تقریر عربی میں تھی جس کا بلیغ ترجمہ مولانا ابوالحسن علی نے سنایا، ڈپٹی ہائی کمشنر کی تقریر انگریزی میں تھی جس کو تعلیمیافتہ طبقہ نے بہت پسند کیا۔

دوسرے دن صبح کو مجلس مقالات ہوئی، اس میں مولانا عبدالماجد صاحب، پروفیسر محمد مجیب صاحب، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، ضیاء الحسن صاحب فاروقی، ڈاکٹر امیر حسن عابدی اور ڈاکٹر عابد صاحب نے مقالے پڑھے، وقت کی تنگی کی وجہ سے شبیر احمد خاں صاحب غوری، حافظ غلام مرتضیٰ صاحب اور سید صباح الدین عبدالرحمن کے مقالات نہ پڑھے جا سکے، جو انشاء اللہ جوبلی کی روداد کے ساتھ کتابی شکل میں شائع ہوں گے، مولانا عبدالماجد صاحب کے مقالہ "شبلی" کا لوگوں کو بڑا اشتیاق تھا اس لیے اسی پرچہ میں شائع کیا جا رہا ہے۔

دوسرے دن شب کو پنڈت آنند نرائن ملا کی صدارت میں ایک ادبی نشست یا مختصر بزم مشاعرہ ہوئی جس میں روش صدیقی، حبیب احمد صدیقی، جگناتھ آزاد، عارف عباسی، سروش اردنادی، شمس الرحمن قیسی فاروقی ڈپٹی کلکٹر، ذی النورین صاحب کین کمشنر اور یحییٰ اعظمی نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

جوبلی مالی حیثیت سے بھی بہت کامیاب رہی، ان رقموں کے علاوہ جو جوبلی سے پہلے وصول ہو چکی تھیں اور جن کا معارف میں اعلان ہو چکا ہے، جوبلی کے موقع پر حکومت ہند نے پچاس ہزار، حکومت اتر پردیش نے دس ہزار، نواب بیگم بھوپال نے چھ ہزار، ملا طاہر سیف الدین نے بارہ ہزار رابطہ اسلامیہ مکہ معظمہ نے پانچ ہزار، سعودی عرب کے سفیر نے دو ہزار، حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی نے ایک ہزار، ڈاکٹر عبداللطیف صاحب کویت نے ایک ہزار کے عطیے دیے، ان میں سے بعض کے چک جوبلی ہی میں وصول ہو گئے، باقی آئندہ ملیں گے۔

دارالمصنفین کو ریاست بھوپال سے بہت پرانا تعلق ہے، اسی کی امداد سے دارالمصنفین کا قیام عمل میں آیا تھا، اس تعلق کی بنا پر ساجدہ سلطانہ صاحبہ نواب بیگم بھوپال نے اپنی تشریف آوری سے جوبلی کو عزت بخشی، اور ہمارے صوبہ کی وزیر علیا شریمتی سوچیتا کرپلانی نے از راہ قدردانی جوبلی کو نوازا، اس لیے ان دونوں کو دارالمصنفین کی طرف سے ایڈریس دیے گئے جن کا انھوں نے مناسب جواب دیا، سوچیتا کرپلانی نے اپنی تقریر میں ہر مذہب و ملت، ہر تہذیب و ثقافت اور ہر زبان کے ساتھ ہمدردی اور رواداری اور ان کے تحفظ کا یقین دلایا، پوری تقریر اردو میں تھی، ایک لفظ بھی ثقیل ہندی کا نہ آنے پایا تھا، یہ تقریر اپنے خیالات اور زبان کے لحاظ سے اس قابل تھی کہ دوسرے وزراء اس سے سبق حاصل کریں۔

جوبلی کی کامیابی میں ان تمام محسنوں کا حصہ ہے جنھوں نے سرمایہ کی فراہمی میں کوشش کی یا اس کے انتظامات میں مدد دی، یا اپنی شرکت سے اس کی رونق بڑھائی لیکن اس کا اصلی سہرا ڈاکٹر ذاکر صاحب کے سر ہے، انھوں نے ہر قدم پر ہمت بڑھائی اور ہر قسم کی امداد فرمائی، جوبلی کے بہت سے شرکا خصوصاً ارکان حکومت کو انہی کی کشش کھینچ کر لائی تھی، ہمارے رفیق کار سید صباح الدین عبدالرحمن نے جوبلی کی کامیابی کے لیے رات دن ایک کر دیے، درحقیقت یہ جوبلی انہی کی ہمت و حوصلہ کا نتیجہ تھی۔

ہم ان تمام محسنوں خاص طور سے ڈاکٹر ذاکر صاحب، شریمتی سوچیتا کرپلانی، نواب بیگم بھوپال، کرنل بشیر حسن زیدی، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، سید شہاب الدین دسنوی، مولانا محمد عمران خاں، سید علی جواد زیدی، مولانا سید ابوالحسن علی، منشی عبدالعزیز صاحب انصاری اور مولانا جمال میاں فرنگی محلی کے شکر گزار ہیں جن کی خصوصی امداد سے جوبلی میں اتنی کامیابی حاصل ہوئی، ضلع کے کلکٹر مسٹر ایس، کے ماڈول اور ایس پی مسٹر بھلا کے بھی ہم مشکور ہیں کہ انھوں نے جوبلی کے انتظامات میں پورے اشتراک و تعاون سے کام لیا۔

آخر میں دار المصنفین کی سب سے پرانی یادگار اور اس کے معمار مولانا مسعود علی ندوی کا ذکر ضروری ہے جن کا نام ان کی معذوری کی وجہ سے کہیں نہیں آسکا، گو اب وہ بالکل معذور ہو چکے ہیں اور ان کی حیثیت اب تبرک کی رہ گئی ہے، لیکن ان کا وجود ہمارے لیے غنیمت ہے اور ہم کو خوشی ہے کہ یہ جوبلی ان کی زندگی میں انجام پاگئی اور اس کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، دار المصنفین کی مجلس انتظامیہ کے صدر جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب کو بھی دار المصنفین اور اس کے کارکنوں سے بڑا گہرا تعلق ہے اور وہ اپنی صحت کی خرابی اور معذوری کے باوجود سال میں ایک دو مرتبہ گرتے پڑتے دار المصنفین پہنچ جاتے ہیں، اس جوبلی میں بھی شرکت سے انھوں نے اس کا وقار بڑھایا، ان کی جگہ پر کرنے والا کوئی دوسرا نہ تھا، یہ جوبلی کی مختصر سرگذشت ہے، اس کی تفصیلی رُوداد انشاء اللہ کتابی شکل میں شائع ہوگی۔

اعظم گڈھ میں مولانا شبلی کی دوسری یادگار شبلی کالج اور شبلی اسکول ہے، جوبلی کے موقع پر دونوں بھی اپنے حصہ سے محروم نہیں رہے، ڈاکٹر ذاکر صاحب نے کالج کے شعبۂ کیمیا کی عمارت کا اور نواب بیگم بھوپال نے اسکول کے بھوپال ہال کا سنگ بنیاد نصب کیا، بیگم صاحبہ نے اسکول کو چار ہزار روپئے بھی عطا فرمائے اسکول کے ارکان نے بیگم صاحبہ کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے کالج کے جلسۂ تقسیم اسناد کو خطاب فرمایا۔

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینے زائر حرم حمید صدیقی نے وفات پائی، وہ اس دور کے بہترین نعت گو تھے، ان کی نعتیں محض شاعرانہ صناعی نہیں بلکہ سچے جذبات اور دلی کیفیات کی ترجمان ہیں، وہ جیسی پاکیزہ نعتیں کہتے ویسے ہی ترنم سے پڑھتے بھی تھے، ان کی نعتیں صاحب نعت ﷺ کی بارگاہ میں اتنی مقبول تھیں کہ ان کو دس بارہ مرتبہ آستان نبوی کی حاضری کی سعادت حاصل ہوئی، طبعاً بھی بڑے مہذب اور شریف تھے، ادھر عرصہ سے ان کی صحت خراب رہتی تھی، ایک دن معلوم ہوا کہ ریاض نبوی کا زمزمہ سنج باغ رضوان میں پہنچ گیا، اللہ تعالیٰ مدح نبوی کے طفیل میں ان کی مغفرت فرمائے۔

مقالات

اسلام میں دوسرے مذاہب
اور
اہلِ مذاہب کی حیثیت

از شاہ معین الدین احمد ندوی

جون کے معارف میں "بعض رائج الوقت اصطلاحیں اور ان کا پس منظر" کے عنوان سے ایک مضمون نکلا تھا، اس کی اشاعت کے بعد ہی محسوس ہوا کہ اس کے بعض پہلو تشنہ رہ گئے ہیں، اس دوران میں بعض استفسارات بھی آئے جن میں یہ سوال کیا گیا تھا کہ اسلامی احکام کی رو سے دوسرے مذاہب خصوصاً ہندو مذہب کی حیثیت کیا ہے، اور ان کے ماننے والوں کے ساتھ طرز عمل کے بارہ میں اسلام کی ہدایات کیا ہیں، معلوم ہوا کہ بعض دینی مدارس میں بھی یہ استفسار آیا ہے، اس مسئلہ میں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق دوسرے مذاہب والوں میں بڑی غلط فہمیاں ہیں، اس لیے اس کو صاف کر دینا ضروری معلوم ہوا۔

اصل بحث سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس بارہ میں اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب اور اہل مذاہب کا عقیدہ اور طرز عمل کیا رہا ہے، اس کے بعد ہی اس مسئلہ میں اسلام اور دوسرے مذاہب کا صحیح موازنہ اور اسلام کی فراخدلی اور رواداری کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

تمام مذاہب پر تو گفتگو طویل ہوگی، اس لیے مثالاً دنیا کے تین بڑے مذاہب یہودیت، عیسائیت اور

ہندو دھرم کو پیش کیا جاتا ہے، یہودیت اور عیسائیت دونوں دین ابراہیمی کی شاخیں ہیں، ان میں بہت سی باتیں مشترک ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہودیت ہی کی اصلاح و تجدید کیلئے مبعوث ہوئے تھے، اس قربت کے باوجود یہودی اور عیسائی دونوں ایک دوسرے کو گمراہ اور قابل نفرت اور یہودی تو نعوذ باللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کذاب اور مفتری سمجھتے ہیں اور انہی نے انکو عیسائیوں کے گمان میں سولی پر چڑھوایا تھا[1]، ان دونوں کی نفرت و عداوت تاریخ کی بڑی دردناک داستان ہے، جب عیسائیوں کے ہاتھوں میں قوت آئی تو انھوں نے یہودی مذہب اور یہودیوں کے تحقیر و تذلیل اور ان کے استیصال کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، اور انکو ذلیل و خوار کرکے ساری دنیا میں منتشر کر دیا، ان کے ساتھ غلاموں سے بدتر سلوک تھا، "یہودی" کا لفظ مدتوں عیسائی دنیا میں گالی کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا، یہ تو پرانی داستان ہے، ہٹلر نے یہودیوں کو جس طرح مٹایا وہ سب کی نگاہ کے سامنے کا واقعہ ہے اسی طرح یہودی اور عیسائی دونوں اسلام اور مسلمانوں کے سخت دشمن رہے، کوئی ایسا الزام نہیں ہے جو انھوں نے اسلام اور مسلمانوں پر نہ لگایا ہو اور یہ عداوت آج بھی قائم ہے، وہ صدیوں سے جس طرح مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے چلے آرہے ہیں، اس سے ہم سب واقف ہیں اور یہ عداوت اور دشمنی آج بھی فلسطین میں مجسم شکل میں موجود ہے،

رواداری کا سب سے زیادہ دعویٰ ہندو مذہب کو ہے، مگر اس کی رواداری کا یہ حال ہے کہ اس نے خود ہندوؤں کے ایک طبقہ کو ہزاروں برس سے اچھوت بنا رکھا ہے اور اس کے ساتھ غلاموں سے بدتر سلوک کیا جاتا ہے، اور ہندو دوسرے مذہب والوں کو ملیچھ اور چنڈال سمجھتے ہیں، قدیم ہندوؤں کی رواداری کا حال البیرونی کی زبان سے سنیے جو ہندوؤں کے علمی کمالات کا بڑا مداح و معترف اور ان کے مذہب کا بڑا واقف کار ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"ہندو دین میں ہم سے کلی مغائرت رکھتے ہیں، دوسرے مذہب والوں کو یہ لوگ ملیچھ یعنی ناپاک

[1] ابھی چند مہینے ہوئے عیسائیوں کی دینی کونسل نے یہودیوں کو اس الزام سے بری قرار دیا ہے،

سمجھتے ہیں، اور ان سے ملنا جلنا، شادی بیاہ کرنا، ان کے قریب جانا، ان کے ساتھ بیٹھنا اور کھانا پینا ناجائز سمجھتے ہیں، جس چیز میں کسی دوسری قوم کی آگ یا پانی سے کام لیا گیا ہو اس چیز کو ناپاک سمجھتے ہیں اور اس کی اصلاح کی کوئی شکل نہیں ہے، اگر نجس چیز پاک چیز سے مل کر پاک ہو سکتی ہے، لیکن ہندوؤں میں جو شخص ان میں سے نہیں ہے اور ان میں داخل ہونا یا ان کا مذہب قبول کرنا چاہتا ہے اس کو اس کی اجازت نہیں ہے، اور یہ صورت حال انسانیت کے ہر رشتے کو توڑ دیتی ہے۔

یہ لوگ رسم و رواج اور عادات و خصائل میں ہم سے اس درجہ اختلاف رکھتے ہیں کہ اپنے بچوں کو ہم سے اور ہماری وضع و لباس وغیرہ سے ڈراتے ہیں اور ہم لوگوں کو شیطان کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور شیطان کو خدا کا مخالف اور دشمن قرار دیتے ہیں، اگرچہ اس کی نسبت ہم لوگوں (مسلمانوں) کی جانب کیجاتی ہے، لیکن اس سے دوسری قومیں بھی مستثنیٰ نہیں ہیں وہ سب کو شیطان سمجھتے ہیں۔

ان لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ملک صرف انہی کا ملک ہے، انسان صرف انہی کی قوم کے لوگ ہیں۔ بادشاہ صرف انہی کے بادشاہ ہیں، مذہب صرف انہی کا مذہب ہے، علم صرف وہی ہے جو ان کے پاس ہے، یہ لوگ بہت تعلی کی لیتے ہیں، اور جو کچھ تھوڑا بہت علم ان کے پاس ہے اس کو بہت سمجھتے ہیں اور اپنی خود پسندی کی وجہ سے جاہل رہ جاتے ہیں، ان کے اہل علم نہ صرف دوسروں بلکہ اپنی قوم کے نااہل لوگوں سے بھی علم چھپاتے ہیں، ان کے خیال میں ان کے شہروں کے سوا دوسرے شہر ہی نہیں ہیں اور نہ ان کے شہروں کے علاوہ کہیں انسان بستے ہیں اور نہ ان کے علاوہ کسی کے پاس علم ہے، اگر ان سے کہا جائے کہ خراسان اور فارس میں بھی علم ہے تو اس کو غلط سمجھیں گے۔"[1]

یہ تو قدیم ہندوؤں کا حال تھا، ہندو مذہب کے مصلح و مجدد اور جدید ہندویت کے بانی

[1] کتاب الہند ملخصاً

سوامی دیانند سرسوتی نے اسلام اور عیسائیت کی جس قدر مذمت اور قرآن مجید و انجیل پر جیسی سخت اور دل آزار تنقید کی ہے، اس پر ستیارتھ پرکاش کے صفحات شاہد ہیں، اور آج بھی بہت سے ہندو اہل قلم اسلام اور مسلمانوں پر جس طرح حملے کرتے رہتے ہیں وہ سب کی نگاہ کے سامنے ہیں۔

اس کے مقابلہ میں اسلام تمام الہامی مذاہب، ان کے پیغمبروں اور ان کی کتابوں کو مانتا ہے اور اسلامی عقیدے کے رو سے کوئی قوم اور کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس کی ہدایت و رہنمائی کے لیے خدا کے پیغمبر نہ مبعوث ہوئے ہوں، قرآن مجید میں اس کی پوری تصریح ہے:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰی قَوْمِهِمْ (روم ۵) — اور ہم نے تم سے پہلے کتنے ہی رسول انکی قوم کی رہنمائی کے لیے بھیجے۔

وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (یونس ۵) — اور ہر قوم کی رہنمائی کے لیے پیغمبر آئے۔

اور مسلمانوں کو ان تمام رسولوں اور ان کی کتابوں پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا، اس میں کسی قسم کی تفریق گوارا نہیں کی۔

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ — ہر ایک مسلمان خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا اور ہم خدا کے رسولوں کے درمیان کسی قسم کی تفریق نہیں کرتے

اس سے انکار سخت گمراہی ہے۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا (نساء ۲۰) — اور جو شخص خدا کا اور اسکے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اسکے رسولوں کا اور یوم آخرت کا انکار کرتا ہے وہ سخت گمراہی میں ہے۔

اس لیے مسلمان تمام الہامی مذاہب، ان کے پیغمبروں اور ان کی لائی ہوئی کتابوں پر ایمان

لانے کے لیے مجبور ہیں، اس کے بغیر وہ مسلمان نہیں کہلا سکتے۔

حقیقت اسلام کوئی نیا مذہب نہیں ہے، بلکہ اسی اصولی اور بنیادی دین کی آخری اور تکمیلی شکل ہے جس کی تعلیم تمام انبیاء علیہم السلام دیتے چلے آئے ہیں، قرآن مجید کا ارشاد ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ (شوریٰ ۲۷)

اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کی اس نے نوح کو وصیت کی تھی اور جس کی ہم نے تمھاری طرف وحی بھیجی اور جس کی ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو وصیت کی تھی کہ دین کو قائم کرو، اس میں تفرقہ نہ ڈالو، مشرکین پر وہ دین گراں ہے جس کی طرف تم ان کو بلاتے ہو، اور اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی طرف کھینچ لاتا ہے اور جو اسکی طرف رجوع کرتا ہے اس کو سیدھا

اور ان تمام مذاہب کے ماننے والوں نے اپنے اپنے زمانہ میں جو اچھے اعمال کیے ہیں وہ قبول ہوں گے اور آخرت میں ان کو ان کا اجر ملے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (بقرہ ۷)

بیشک مسلمان یہودی اور نصاریٰ اور صابیوں میں سے جو لوگ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے تو انکو انکے اعمال کا اجر ان کے رب کے یہاں ملے گا، ان پر کسی قسم کا خوف طاری نہ ہوگا، اور نہ وہ آزردہ خاطر ہوں گے

قرآن مجید کے مخاطب اول عرب تھے، اور وہ زیادہ تر دین ابراہیمی کے سلسلہ کے پیغمبروں سے واقف تھے، اور اسلام کے مقاصد میں ایک بڑا مقصد ان مذاہب کی اصلاح بھی تھی، اسلیے کلام مجید انھی کے پیغمبروں اور ان کی کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے، سارے مذاہب اور ان کے پیغمبروں کا ذکر دشوار بھی تھا اور ضروری بھی نہیں تھا جن پیغمبروں کا ذکر نہیں ہے، یا جن کے پیغمبر ہونے کا گمان ہو سکتا ہے یا کوئی قوم کسی کو اپنا پیغمبر مانتی ہے ان کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ وہ توحید کی تعلیم دیتے ہیں، کیونکہ پیغمبروں کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد توحید اور خداشناسی کی تعلیم ہے، کلام مجید میں ارشاد ہے:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ	اور یقیناً ہم نے ہر قوم میں رسول بھیجا کہ اللہ کی پرستش کرو اور جھوٹے معبودوں سے بچو
وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ (انبیاء - ۲)	اور ہم نے تم سے پہلے کسی نبی کو نہیں بھیجا مگر اس کو یہی وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، اس لیے مجھی کو پوجو۔

آج دنیا کے جتنے قدیم مذاہب ہیں ان کے پیغمبروں کے حالات افسانوں میں ایسے گم ہیں اور ان کی تعلیمات میں اتنی تحریف ہو چکی ہے کہ اصل حقیقت کا پتہ چلانا مشکل ہے، اس لیے کلام مجید میں جن پیغمبروں کا ذکر ہے، ان پر اور ان کی کتابوں پر ایمان لانا مسلمانوں کے لیے ضروری ہے چنانچہ قرآن مجید نے یہود و نصاریٰ کو اہل کتاب میں شمار کیا ہے، اور ان کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے جائز ہے، ان کی عورتوں سے نکاح کیا جا سکتا ہے، سچے اور خداشناس عیسائیوں کی تعریف کی ہے، لیکن جن پیغمبروں کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے، مسلمان ان کو اذعان و یقین کے ساتھ پیغمبر نہیں کہہ سکتے کیونکہ پیغمبر ماننے کے بعد ان پر ایمان لانا ضروری ہو جائے گا، اور ایمان انھی چیزوں پر لایا جا سکتا ہے جن کی کلام مجید میں صراحت ہے، لیکن جو قومیں جن برگزیدہ شخصیتوں کو پیغمبر مانتی ہیں، اگر وہ پیغمبرانہ اوصاف

سے متصف ہیں، اور ان کی تعلیم میں توحید ہے تو ان کو مسلمان یقین کے ساتھ پیغمبر تو نہیں مان سکتے اس لیے کہ کلام مجید میں ان کا ذکر نہیں، اور اس کے بغیر ان پر ایمان نہیں لایا جا سکتا، لیکن ان کو خدا کا برگزیدہ بندہ ماننا بہرحال چاہیے اور ان کے احترام و عظمت میں فرق نہ کرنا چاہیے۔

ہندوستان کی سرزمین بھی خدا کے پیغمبروں سے خالی نہیں رہی ہے، حضرت مجدد الف ثانی جیسے بزرگ جو عقائد میں بڑے متشدد ہیں، ہندوستان میں بعثت انبیاء کے قائل ہیں، اور ان کو یہاں کے بعض شہروں میں نور نبوت نظر آتا تھا، چنانچہ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

"ازیں معاملہ می نماید نیز می باید کہ از اہل ہند پیغمبراں مبعوث شدہ اند و دعوت بصانع جل شانہ فرمودہ اند در بعضے از بلاد ہند محسوس می گردد کہ انبیا علیہم الصلاۃ والتسلیمات در ظلمات شرک در رنگ مشعلہا افروختہ اند و اگر کسے خواہد تعیین آں بلاد نماید" (مکتوبات ج اول مکتوب دوصد و پنجاہ و نہم)

لیکن نہ انھوں نے ان مقامات کی تصریح کی ہے اور نہ ان پیغمبروں کی، جن برگزیدہ شخصیتوں کے متعلق پیغمبر اور جن کتابوں کے متعلق الہامی ہونے کا گمان ہو سکتا ہے، ان کے حالات اس قدر افسانوں میں گم ہیں اور ان کی تعلیمات میں اتنی تحریف ہو چکی ہے کہ اصل حقیقت کا پتہ چلانا دشوار ہے، اس کے باوجود بعض عرفا، کو کرشن جی کی بانسری میں نبوت کی لے سنائی دیتی ہے اور بہت سے مسلمان ان کو خدا کا برگزیدہ بندہ مانتے ہیں، اور اس دور کے ایک نامور عالم مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کو مہاتما بدھ میں نبوت کا پرتو نظر آتا تھا، اور وہ کلام مجید کے ذوالکفل اور کپل وستو کو ایک ہی شخصیت قرار دیتے تھے۔

اسلام میں انسانی مساوات کے اصول نے بھی بڑی حد تک دوسری اقوام و مذاہب کے ساتھ تنگ دلی، تنگ نظری اور تعصب کا خاتمہ کر دیا ہے، اس میں نہ ہندو مذہب کی طرح غیر ہندوؤں سے چھوت ہے، اور نہ ادنیٰ و اعلیٰ کی تقسیم ہے، نہ مغربی قوموں کی طرح رنگ و نسل اور قوم و وطن

کی تفریق ہے نہ ایرین اقوام کی طرح نسلی پستی و بلندی ہے بلکہ اسلام کی نگاہ میں انسانی حیثیت سے سارے انسان برابر ہیں، معیار فضیلت صرف خدا ترسی ہے۔

ایھا الناس ان ربکم واحد	لوگو! تمھارا پروردگار ایک ہے، تمھارا
وان آباء کم واحد کلکم لآدم	باپ ایک ہے، تم سب اولاد آدم ہو اور
وآدم من تراب اکرمکم عند اللہ	آدم مٹی سے بنے تھے، اللہ کے نزدیک تم میں
اتقاکم ولیس لعربی فضل علی	سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو اللہ سے
عجمی الا بالتقویٰ	سب سے زیادہ ڈرتا ہے، عربی کو عجمی پر کوئی
	فضیلت نہیں مگر تقویٰ کی بنا پر۔

اس تعلیم نے نسلی و جغرافی تعصب و تنگ نظری کے سب دروازے خود بخود بند ہو جاتے ہیں، اسلام نے تو بلا تفریق مذہب و ملت تمام انسانوں کو خدا کا کنبہ قرار دیا ہے، اور سب کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا حکم دیا ہے۔ اس رشتہ سے سارے انسان بھائی بھائی بن جاتے ہیں، بخاری کی حدیث ہے کہ "آپس میں حسد نہ کرو ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو اور سب خدا کے بندے بھائی بھائی بن جاؤ"۔ (بخاری کتاب الادب باب الہجرت) ایک دوسری حدیث میں تصریح ہے۔

الخلق کلھم عیال اللہ فاحب	یعنی ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے اور اللہ کے
الخلق الی اللہ من احسن الی	نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ وہ مخلوق ہے
عیالہ	جو اس کے کنبے (یعنی تمام انسانوں) کے ساتھ بھلائی کرے۔

اس لیے اسلام میں انسانوں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کے جتنے احکام ہیں ان میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق نہیں ہے۔ مسلم کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، کوئی بندہ اس وقت تک مومن نہیں کہلا سکتا جب تک اپنے

پڑوسی (باختلاف روایت) یا بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے (مسلم کتاب الایمان) ایک دوسری روایت میں ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا جب تک دوسرے لوگوں کے ساتھ وہی پسند نہ کرے جو اپنی ذات کے لیے پسند کرتا ہے، اور جب تک وہ دوسروں کے ساتھ محض خدا کے لیے محبت نہ کرے۔ (مسند احمد بن حنبل)

یہ احکام مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لیے عام ہیں، اور اس بارہ میں سب سے بڑا رہنما خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے۔ آپ غیر مسلموں کے ساتھ بھی احسان و سلوک فرماتے تھے۔ پڑوسی غیر مسلموں کی خبرگیری کرتے۔ وہ بیمار ہوتے تو ان کی عیادت فرماتے (بخاری کتاب المرضیٰ باب عیادۃ المریض) غیر مسلموں کو مہمان بناتے اور خود بھوکے رہ کر ان کو کھانا کھلاتے (مسند احمد بن حنبل) ان کی میزبانی کی خدمت انجام دیتے۔ اگر صحابہ کرام اپنے کو خدمت کے لیے پیش کرتے تو فرماتے میں خود خدمت کروں گا۔ (شرح قاضی عیاض خفاجی)

غیر مسلموں کو مسجد میں ٹھہراتے، بلکہ ان کو ان کے طریقہ پر مسجد میں عبادت کرنے کی بھی اجازت دیدیتے، ایک مرتبہ نجران کے عیسائیوں کا وفد مدینہ آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مسجد میں حاضر ہوا، اس وقت ان کی نماز کا وقت آ گیا تھا۔ اس لیے انھوں نے مسجد ہی میں نماز شروع کر دی۔ بعض مسلمانوں نے روکنا چاہا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو منع کر دیا۔ اور فرمایا نماز پڑھ لینے دو، چنانچہ عیسائیوں نے مسجد نبوی کے اندر نماز پڑھی۔[1]

غیر مسلموں کے جنازے کا احترام کرتے تھے، ایک مرتبہ ایک جنازہ گذرا آپ اس کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے، لوگوں نے عرض کیا کہ یہودی کا جنازہ ہے، فرمایا کیا وہ انسان نہیں ہے۔[2]

پڑوسیوں سے حسن سلوک میں بھی مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمر

---

[1] زاد المعاد ج اول ص ۵ [2] نسائی کتاب الجنائز باب القیام للجنازۃ

نے بکری ذبح کرائی تو غلام کو حکم دیا کہ پہلے فلاں پڑوسی کو گوشت بھجوانا، ایک شخص نے کہا وہ تو یہودی ہے، جواب دیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی اس قدر تاکید فرمائی ہے کہ ہم لوگوں کو اندیشہ ہوگیا تھا کہ آپ ان کو وراثت میں شریک کردیں گے، یہ اس کا ثبوت ہے کہ صحابہ کرام پڑوسیوں میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق نہیں کرتے تھے۔

کفار و مشرکین کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لطف و رحمت کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ آپ نے کبھی ان مشرکین کے لیے بھی بد دعا نہیں فرمائی جنھوں نے آپ کی دشمنی اور اسلام اور مسلمانوں کی بیخکنی کا کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا تھا، اور ہمیشہ ان کے حق میں یہی دعا فرماتے رہے

اللهم اهد قومی فانهم لا یعلمون — اے اللہ میری قوم کو ہدایت دے وہ اپنا اچھا برا نہیں سمجھتی۔

ایک صحابیؓ نے ان کے جور و ستم سے تنگ آکر ان کے لیے بد دعا کی درخواست کی تو فرمایا

انی لم ابعث لعاناً وانما بعثت رحمة — میں لعنت کرنے کے لیے نہیں بھیجا گیا ہوں بلکہ رحمت بناکر بھیجا گیا ہوں۔

غیر مسلموں کے ساتھ آپ کی عفو و درگذر اور رافت و رحمت کا سب سے بڑا منظر فتح مکہ میں نظر آتا ہے، مکہ فتح ہونے کے بعد مشرکین کی قوت پارہ پارہ ہوگئی تھی، اور جنھوں نے شان نبوی میں گستاخی آپ کی ایذارسانی، اسلام کے استیصال اور مسلمانوں پر جور و ستم کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا، ان کے لیے کوئی جائے پناہ نہ رہ گئی تھی، اس وقت بھی آپ نے ان سے کسی قسم کا بدلہ نہیں لیا اور فرمایا!

لا تثریب علیکم الیوم اذهبوا انتم الطلقاء — آج تم پر کوئی الزام نہیں، جاؤ سب آزاد ہو۔

اس قسم کے اور بھی بہت سے واقعات ہیں جن کے نقل کرنے کی گنجایش نہیں ہے، کفار و مشرکین کے ساتھ حسن سلوک کے ثبوت کے لیے چند واقعات کافی ہیں، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب بہت سے ممالک زیر نگیں ہوگئے اور ان کے غیر مسلم باشندے اسلام کی رعایا بن گئے، اور خلافت اسلامیہ کا باقاعدہ نظام قائم ہوگیا تو غیر مسلموں کو ان کے مذہب اور رسم و رواج کی پوری آزادی دی گئی اور ان میں کوئی مداخلت نہیں کی گئی جس پر عراق، شام اور ایران وغیرہ کے معاہدے شاہد ہیں، جو آج بھی تاریخوں میں محفوظ ہیں،

اسلام نے غیر مسلم رعایا کو جو حقوق دیے ہیں، ان کا مقابلہ آجکل کے جمہوری[1] حقوق سے کرنا صحیح نہیں ہے، لیکن اس زمانہ کے لحاظ سے یہ حقوق ایسے تھے جو ادنیٰ اور محکوم طبقوں کو خود ان کی قومی و ملکی حکومت میں بھی حاصل نہ تھے، اس لیے وہ اپنی حکومت سے زیادہ مسلمانوں کی حکومت کے وفادار بن گئے تھے، اس مضمون میں اس تفصیلی بحث کی گنجایش نہیں ہے، مولانا شبلی مرحوم نے اپنے مشہور مضمون حقوق الذمیین میں اس پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے، حضرت عمرؓ کو ذمیوں کے حقوق کا اتنا خیال تھا کہ اپنی شہادت کے وقت دم آخر آیندہ ہونے والے خلیفہ کو جو وصیتیں کی تھیں، ان میں ایک وصیت یہ بھی تھی کہ آیندہ جو خلیفہ منتخب ہو وہ ذمیوں کے حقوق کا پورا لحاظ رکھے، ان سے جو وعدہ ہے اس کو پورا کیا جائے، ان کے دشمنوں سے لڑا جائے، ان پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے[2]

---

[1] اس جمہوری دور میں بھی کھانے کے دانت اور ہوتے ہیں اور دکھانے کے اور، چنانچہ آج بھی افریقہ کی مغربی نوآبادیات میں کالے گوروں کے جو حقوق میں جو فرق ہے اور امریکہ جیسے ترقی یافتہ اور جمہوریت نواز ملک کا اپنے ملک کے ریڈ انڈین کے ساتھ جو سلوک رہا ہے، وہ سب کو معلوم ہے، مدتوں کے بعد اب جاکر اس تحریک کے وقت مختلف رنگ و نسل کی قوموں کے درمیان حقوق کی مساوات کا قانون بنا ہے لیکن اب بھی امریکہ کا ایک طبقہ اس کا مخالف ہے۔

مسلمانوں کی رواداری ایسی زندہ حقیقت ہے جس کا مشاہدہ آج بھی کیا جاسکتا ہے، اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی بہت سی حکومتیں ہیں، ان میں سعودی عرب یا زیادہ سے زیادہ جزیرۃ العرب کے علاوہ تمام حکومتوں میں غیر مسلم اقلیتیں ہیں، جن کی تعداد ہندوستان کے مسلمانوں سے کہیں کم ہے ان میں سے اکثر حکومتوں کا مذہب اسلام ہے، اس کے باوجود ان کی غیر مسلم اقلیتوں کو مسلمانوں کے برابر شہری و ملکی حقوق حاصل ہیں اور ان میں اختلاف مذہب کی بنا پر کوئی فرق و امتیاز نہیں کیا جاتا اور وہ اپنے ملکوں میں امن و سکون اور عزت و عافیت کے ساتھ زندگی بسر کر رہی ہیں، بلکہ متعدد اسلامی حکومتوں میں خصوصاً جو ہندوستان کے قریب ہیں ہندوؤں کی بھی خاصی تعداد آباد ہے، مگر ان میں سے کسی کو بھی ظلم و زیادتی کی کبھی شکایت نہیں ہوئی حتی کہ جو بت پرست ہیں ان کی بت پرستی میں بھی کوئی مزاحمت نہیں کیجاتی، حالانکہ مسلمانوں کے عقیدے میں بت پرستی اتنی ہی مذموم ہے جتنی ہندوؤں کے عقیدے میں گائے کا ذبیحہ، لیکن ہندوستان میں جہاں پانچ کروڑ مسلمان آباد ہیں گائے کا ذبیحہ قانوناً بند کر دیا گیا، اور اسلامی ملکوں میں بت پرستوں کو بت پرستی کی کھلی آزادی ہے اس سے زیادہ مسلمانوں کی رواداری کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے[1]۔

اسلام اور مسلمانوں پر غیر مسلموں کا ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ اپنے علاوہ دوسرے اہل مذاہب کو کافر یا مشرک کہتے ہیں، اس اعتراض کے جواب کے لیے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے، اولاً تو یہ کلیۃً ہی صحیح نہیں ہے، مسلمان کسی غیر مسلم موحد یا ایسے اہل مذاہب کو جو کسی پیغمبر یا آسمانی کتاب کو مانتے ہیں کافر نہیں کہتے، بلکہ اہل کتاب مانتے ہیں، صرف ان لوگوں کو کافر یا مشرک کہتے ہیں جو خدا کو نہیں مانتے یا اس کی توحید کے قائل نہیں ہیں، اور اس کی الوہیت، کبریائی اور عبادت میں دوسری طاقتوں کو شریک کرتے ہیں، اور یہ مسلمانوں پر موقوف نہیں، یہودی اور عیسائی بھی ان کو کافر یا مشرک کہتے ہیں،

[1] اسکی مثال میں پاکستان کو پیش کرنا صحیح نہ ہوگا، ہندوستان اور پاکستان کے ہندو مسلمانوں کو جو شکایتیں ہیں وہ ہندوستان کی تقسیم اور سیاسی اختلافات کا نتیجہ ہے، مذہب سے ان کا تعلق نہیں ہے۔

ان کے یہاں بھی یہ اصطلاحیں موجود ہیں، بلکہ یہ دونوں خود ایک دوسرے کو گمراہ سمجھتے ہیں، عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت پر عقیدہ نہ رکھنے والوں کو گمراہ اور نجات اخروی کا مستحق نہیں سمجھتے[1] خود ہندو عرصہ دراز تک اپنے علاوہ دوسروں کو ملیچھ اور چنڈال سمجھتے رہے، جو کافر و مشرک سے کم مکروہ نہیں ہے، اور غیر ہندوؤں سے چھوت چھات کا سلسلہ تو آج بھی جاری ہے، ایسی حالت میں تنہا مسلمان اس کے مجرم نہیں بلکہ عیسائی، یہودی اور ہندو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں،

حقیقت یہ ہے کہ توحید اور خداشناسی انسانیت کی تکمیل اور اس کی عظمت و شرف کا سنگ بنیاد ہے، اسی سے تمام محاسن اخلاق کی شاخیں پھوٹتی ہیں، اس لیے سارے انبیاء علیہم السلام اس کی تعلیم دیتے چلے آئے ہیں، مگر زمانہ کے امتداد اور مختلف اسباب و حالات کی بنا پر ان میں توحید قائم نہ رہ سکی اور کسی نہ کسی نوع کا شرک ان میں رائج ہو گیا، اور بعض مذاہب میں تو کھلی ہوئی بت پرستی رائج ہو گئی، اس لیے اسلام نے جو تمام گذشتہ مذاہب کی اصلاح و تکمیل کے لیے آیا تھا، توحید کا ایسا خالص اور بلند تصور پیش کیا جس میں کسی پہلو سے شرک کی گنجائش نہیں تھی، اس نے شرک جلی اور شرک خفی کے تمام راستے بند کر دیے، وہ توحید کے مصفا دامن پر شرک کا دھبہ بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

توحید ایسی مسلمہ صداقت اور شرک و بت پرستی ایسی مذموم چیز ہے کہ کوئی قوم بھی اس کا انتساب اپنی جانب پسند نہیں کرتی، اور وہ قومیں بھی جو اس میں مبتلا ہیں اس کی تاویل کرتی ہیں لیکن شرک کی جو شکل بھی ہو اور بت پرستی کا جو فلسفہ بھی بیان کیا جائے اسلام کی نگاہ میں وہ شرک و بت پرستی ہی کہلائے گا، وہ اس معاملہ میں کسی درمیانی راہ کا قائل نہیں، اسکی نگاہ میں

[1] ان عیسائیوں کا ذکر نہیں جن کو مذہب سے کوئی علاقہ نہیں رہ گیا ہے، مذہبی عیسائیوں کا یہی عقیدہ آج بھی ہے، رومن کیتھولک تو اس معاملہ میں اور بھی سخت ہیں۔

میں توحید کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ سب شرک ہے، اسی لیے صحیح العقیدہ مسلمان، خود عام مسلمانوں
کے ان رسوم و اعمال کو گوارا نہیں کرتے جن میں شرک کا ادنیٰ شائبہ بھی پایا جائے اور ایسے مسلمانوں
کو فاسق اور گمراہ سمجھتے ہیں، ایسی حالت میں علانیہ شرک اور بت پرستی کی گنجایش کہاں،

اس سے انکار نہیں کہ ہندو مذہب میں توحید بھی ہے، لیکن یہ مذہب اتنا پرانا ہو چکا ہے اور
اس پر اتنے دور گذر چکے ہیں کہ زمانہ کے تغیرات سے اس میں توحید خالص باقی نہیں رہی، اور اس میں
بہت سے دیوی دیوتا شامل ہو گئے، جن کے ذکر سے ان کی مذہبی کتابیں بھری ہوئی ہیں اور ان کے
عوام تو کھلی ہوئی بت پرستی میں مبتلا ہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کے خواص دیوی
دیوتاؤں کو قادر مطلق نہیں بلکہ اس کا مظہر جانتے ہیں، اس لیے گو اسلامی نقطۂ نظر سے
ان کی توحید بھی خالص نہیں، اس لیے ان کو عام بت پرستوں کی طرح مشرک نہیں کہا جاسکتا، ان میں
جو لوگ اپنے کو موحد کہتے ہیں اور صرف ایک خدا کے قائل ہیں ان کو موحد ماننے میں کسی مسلمان کو کلام نہیں
لیکن عام ہندوؤں کی بت پرستی اتنی کھلی ہوئی ہے کہ خود ہندو مصلحین و مفکرین کو بھی اس کا احساس تھا،
چنانچہ شنکراچاریہ، گرونانک، برہمو سماج اور آخر میں آریہ سماج نے اس کی اصلاح کی کوشش اور بت پرستی
کی مخالفت اور توحید کی صدا بلند کی، آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند نے تو بت پرستی اور ہندوؤں کے تمام
مشرکانہ عقائد و رسوم کی اتنی سخت مخالفت کی ہے کہ مسلمان بھی اس سے زیادہ نہیں کر سکتے، اس لیے اگر
مسلمان بت پرستوں کو مشرک سمجھتے ہیں تو وہ کیوں قصوروار ہیں، اور اس کو تعصب اور عدم رواداری
پر کیوں محمول کیا جائے،

لیکن مسلمان اس معاملہ میں بھی بڑے روادار ہیں، اور عربوں نے ہندوؤں کو کفار و مشرکین کے
زمرہ میں شامل نہیں کیا بلکہ شبہ اہل کتاب کا درجہ دیا ہے، اس سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندویؒ نے
اپنی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" میں بڑی محققانہ بحث کی ہے، ہم اس موقع پر ان کو نقل کرتے ہیں

تاکہ اس مسئلہ میں مسلمانوں کا صحیح نقطۂ نظر معلوم ہو سکے، وہ لکھتے ہیں:

اسلام نے دنیا کی تمام قوموں کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے (۱) مسلمان (۲) اہل کتاب یعنی وہ
قومیں جو کسی ایسی آسمانی کتاب کی پیرو ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے (۳) مشابہ اہل کتاب یعنی وہ قومیں
جو کسی آسمانی تعلیم کی مدعی تو ہیں مگر قرآن میں ان کا ذکر نہیں آیا ہے، اس لیے ان کے اہل کتاب ہونے کا
یقین نہیں مگر گمان ضرور ہے (۴) کفار وہ قومیں ہیں جو کسی آسمانی کتاب کی پیرو نہیں۔

اسلام نے اپنی اسلامی حکومت میں مسلمانوں کا درجہ قومیت اور وطنیت کے امتیاز کے بغیر تمام حقوق
میں یکساں قرار دیا ہے۔ اہل کتاب کے لیے یہ ہے کہ جزیہ ادا کرنے کے بعد وہ تمام حقوق میں مسلمانوں کے برابر ہیں،
ان کا ذبح کیا ہوا جانور کھایا جاسکتا ہے، ان کی لڑکیوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں، ان کے جان و مال
مذہب اور عبادت گاہوں کی حفاظت کی سلطنت ذمہ دار ہے، مشابہ اہل کتاب بھی سوا اس کے کہ
مسلمان ان کا ذبیحہ نہ کھائیں گے اور نہ ان کی لڑکیوں سے نکاح کر سکتے ہیں، اور دوسرے تمام
ملکی حقوق میں وہ اہل کتاب بلکہ خود مسلمانوں کے برابر ہیں، اس بنا پر جب کسی غیر قوم میں اسلام
کی حکومت قائم ہو تو سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ وہ قوم ان چار قسموں میں سے
کس قسم میں آتی ہے، مگر افسوس کہ اس کا فیصلہ خیبر سے آنے والی قومیں آخر تک نہ کر سکیں.....
..... اور سلطان علاء الدین خلجی کے زمانہ تک یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ ہندوؤں کا شمار کس طبقہ میں
ہے، اور یہ ساری ابتری اسی دو عملی کا نتیجہ تھی، لیکن عربوں نے سندھ میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی ایک منٹ
بھی اس فیصلہ میں توقف نہیں کیا کہ ان اقسام میں ہندوؤں کا مرتبہ اسلامی ملکوں میں کیا ہے،
عرب فاتحوں کے نزدیک ہندو مشابہ اہل کتاب تھے، چنانچہ انھوں نے ہندوستان کے
بتخانوں کو یہود کے دیروں اور عیسائیوں کی عبادت گاہوں کے مثل قرار دیا ہے، بلاذری میں یہ تصریح
موجود ہے:

ما البد الا ککنائس النصاری	ہندوستان کا بتخانہ بھی عیسائیوں اور یہودیوں
والیہود و بیوت نیران المجوس	کی عبادت گاہوں اور مجوسیوں کے آتش کدوں
	ہی کی طرح ہے۔

سندھ کی سب سے قدیم عربی تاریخ چچ نامہ کے فارسی ترجمہ میں یہ واقعہ اس طرح مذکور ہے

"محمد بن قاسم نے برہمن آباد (سندھ) کے لوگوں کی درخواست قبول کی اور ان کو اجازت دی کہ سندھ کی اسلامی سلطنت میں اسی حیثیت میں رہیں، جس حیثیت میں عراق اور شام میں یہودی، عیسائی اور پارسی رہتے ہیں[۱]۔"

ایک عرب فاتح کی زبان سے یہ وہ اہم تصریح ہے کہ اس نے ہندوؤں کو وہی حیثیت دی جو بظن غالب کسی آسمانی تعلیم کے پیروؤں کی اسلامی قانون میں ہے، اور ان کے بتخانوں کو وہی درجہ دیا جو اہل کتاب کے معبدوں اور عبادت گاہوں کا اسلام میں ہے، سندھ کی فتوحات کی تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ عرب فاتحوں نے اپنے شرائط کا پوری طرح لحاظ رکھا، ایک بدھ کے پیرو نے ایک موقع پر ایک ہندو کو یہ مشورہ دیا

"ہم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ محمد بن قاسم کے پاس حجاج کا فرمان ہے کہ جو امان چاہے اس کو امان دو، اس لیے ہم کو یقین ہے کہ آپ اس کو مناسب سمجھیں گے کہ ہم اس سے صلح کر لیں، کیونکہ عرب ایماندار اور اپنے معاہدوں کے پابند ہیں[۲]۔"

البیرونی بھی جو ہندوؤں کے مذاہب کا سب سے بڑا واقف کار ہے، ہندو خواص کو موحد اور عوام کو مشرک مانتا ہے، چنانچہ اس نے کتاب الہند کے گیارہویں باب میں جہاں ہندوؤں

---

[۱] چچ نامہ الیٹ ج اول ص ۱۸۶ [۲] ایضاً یہ پوری تحریر عرب و ہند کے تعلقات سے نقل کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب مذکور ص ۲۹۲ تا ۲۹۵

کی بت پرستی اور ان کے دیوی دیوتاؤں کا ذکر کیا ہے، تصریح کے ساتھ لکھا ہے کہ

"بت پرستی عوام کا مذہب ہے، خواص جنھوں نے علم کلام اور مناظرہ کا مطالعہ کیا ہے اور جو حقیقت شناس اور نجات کے طالب ہیں ان کا دامن غیر اللہ کی عبادت سے پاک ہے، اور اس کے ثبوت میں گیتا کے وہ اشلوک نقل کئے ہیں جن میں باسدیو کی زبان سے روحانی مخلوق اور آفتاب و ماہتاب وغیرہ کی پرستش کی مذمت کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ معرفت الٰہی سے قاصر ہیں، وہ خدا کو چھوڑ کر ذرائع کی پرستش کرنے لگتے ہیں، لیکن خدا بے نیاز ہے، اسلیے وہ ان کی مرادیں بھی پوری کرتا ہے، حالانکہ حاجتوں کا اصل پوری کرنے والا وہی ایک ہے جو اس کے واسطے سے ملتی ہے وہ ہمیشہ قائم رہتی ہے"۔ (کتاب الہند)

مسلمان اکابر میں مرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ ہندوؤں کی بت پرستی کی تاویل کو قبول کرتے تھے، اور ان کو اصلاً موحد مانتے تھے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان میں بھی خدا کے پیغمبر مبعوث ہوئے ہیں حضرت مجدد الف ثانیؒ کو تو ہندوستان کے بعض شہروں میں نور نبوت محسوس ہوتا تھا، ہندو گیتا کو الہامی کتاب مانتے ہیں، گو ان کتابوں خصوصاً ویدوں میں دیوی دیوتاؤں کی پرستش بھی ہے، لیکن اسی کے ساتھ توحید اور اعلیٰ درجہ کی اخلاقی و روحانی تعلیمات بھی ہیں اس لیے ان کے مشابہ اہل کتاب ہونے میں شبہ نہیں، اور کسی مشابہ اہل کتاب اور موحد کو کافر نہیں کہا جا سکتا،

آخر میں ہم شاہ عبد العزیز صاحبؒ کی ایک تحریر نقل کرتے ہیں جو انھوں نے اس استفتا کے جواب میں لکھی تھی کہ ہندوؤں کی ہدایت کے لیے کون پیغمبر مبعوث ہوئے اور ان کی ہدایت کے لیے کونسی کتابیں نازل ہوئیں، اور اگر ایسا نہیں ہوا تو اس کا سبب کیا ہے،

شاہ صاحب نے اس کا جو جواب دیا ہے اس سے اس مسئلہ کے بہت سے پہلو صاف

ہو جاتے ہیں، اور ہندوؤں کے اوتاروں کے متعلق بہت سے شکوک و شبہات کا ازالہ ہو جاتا ہے، وہ فرماتے ہیں

(قرآن مجید کی آیۃ وان من امۃ الا خلا فیہا نذیر کا منشا یہ ہے کہ ہر قوم میں خدا سے ڈرانے والے گذرے ہیں کہ ان کو برائیوں کے ارتکاب اور حقوق کے اتلاف سے ڈرائیں، خواہ یہ ڈرانے والے انبیاء و رسل میں سے ہوں یا علماء، واعظوں اور اولیا و عرفا میں سے، اگر روم، حبش، ترکستان اور خطا وغیرہ کی قوموں کے متعلق تفتیش کیجائے تو ان میں کسی پیغمبر کا نشان نہیں ملتا، بلکہ وہ نبی کے مفہوم ہی سے سرے سے ناآشنا ہیں، ان کے بجائے ان میں عباد، زہاد، تارکان دنیا اور خلوت نشینوں کی بزرگی کا اعتقاد راسخ ہے، قوموں کی استعداد اور ان کے علوم کی اختلاف کی بنا پر پیغمبروں کی بعثت کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کا معاملہ مختلف قوموں کے ساتھ مختلف رہا ہے، عرب میں یمن اور شام سے لیکر مصر تک ہدایت الٰہی کا ظہور ایک طریقہ سے ہوا، انبیا و رسل کو مبعوث فرما کر ان کو معجزے عطا فرمائے اور کتابیں نازل فرمائیں، کیونکہ ان ملکوں کے باشندے غیب کی باتوں کے آنے میں خواہ وہ ایک انسان سے دوسرے انسان کی طرف آئیں، بُعد مکانی اور بُعد زمانی کی بنا پر اس کے خوگر تھے کہ قاصد آکر زبانی بیان دے یا کوئی خط اپنے ہمراہ لائے، جس کو اس کی سچائی کی علامت سمجھا جاتا تھا، موجودہ سلاطین اور امراء میں بھی یہی طریقہ رائج ہے کہ وہ کوئی فرمان یا شقہ اپنے کسی معتبر آدمی کے ہاتھ بھیجتے ہیں اور اس کی تصدیق کے لیے بعض چیزیں مثلاً پالکی، ہاتھی اور فوج اس کے ہمراہ کر دیتے ہیں، عرب ملکوں میں ہدایت الٰہی کا یہی طریقہ تھا، لیکن ہندوؤں کے یہاں یہ طریقہ قابل اعتماد نہ سمجھا جاتا تھا، بلکہ بعض چیزوں میں اللہ تعالیٰ کے ظہور، اس کی زبان میں گفتگو اور ایسے افعال کے صدور کو جو مرتبۂ الوہیت کے ساتھ مخصوص ہیں، خرق عادت اور مخلوقات میں حکمرانی کو نیابت حق سمجھتے تھے، اسلیے ان کے یہاں یہی

اختیار کیا گیا، اور وید لکھوائے گئے، اور ایک مدت تک یہ طریقہ جاری رہا، جیسا کہ جوگ باسشٹ، راماین اور گیتا سے معلوم ہوتا ہے، تا آنکہ بیاس نامی ایک شخص پیدا ہوا جس نے اغوائے شیطانی سے ان کے اصل مذہب کو برباد کر کے ان میں بت پرستی رائج کر دی، اس وقت سے ہندو شرک اور صورت پرستی میں مبتلا ہو گئے .... بالجملہ ہندوؤں کے اوتار مظاہر حق تھے، خواہ وہ انسان کی شکل میں ہوں یا شیر اور مچھلی کی شکل میں، عصائے موسیٰ اور حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کی طرح، لیکن ہندو عوام اپنے قصور فہم کی بنا پر ظاہر اور مظہر میں فرق نہ کر سکے اور سب کو معبود بنا کر گمراہی میں مبتلا ہو گئے، یہی حال مسلمانوں کے بہت سے تعزیہ بنانے والوں، قبروں کے مجاوروں، جلالیوں اور مداریوں کا ہے،)

شاہ صاحب کی اصل عبارت یہ ہے:

"مفاد آیۂ قرآنی وان من امۃ الا خلا فیہا نذیر آنست کہ در ہر امتے ترسانندۂ گذشتہ است کہ از ارتکاب قبائح و اتلاف حقوق ترسانند عام از انکہ آں ترسانندہ از انبیاء باشد یا از علماء یا وعاظ یا از اولیاء و عرفاء و اگر از احوال اُمم مختلفہ مثل روم و حبش و ترکستان و خطا و ختن تفتیش کردہ شود ہرگز نشان پیغمبرے نمیدہند کہ در آنہا گذشتہ باشند بلکہ مفہوم نبی را ہم نمی شناسند بیشتر اعتقاد عظمت و بزرگی عباد و زہاد و تارکان دنیا و خلوت نشینان در طبائع آنہا مستحکم است و معاملہ حضرت حق با ہر فرقہ مختلف است باختلاف استعداد ہا و باختلاف علوم مخزونہ آنہا در دیار عرب از یمن تا شام و مصر بیک رنگ ہدایت الٰہی ظہور نمود انبیاء و رسل را مبعوث فرمود و معجزات بر دست آنہا فرید و کتابہا نازل فرمود زیرا کہ اہل ایں بلاد آمدن غیب را اگر چہ از بعضے بشر بہ بعضے بشر باشد بسبب بعد مکانی و بعد زمانی ہمیں طریق می دانستند کہ قاصدے بیاید و پیغام زبانی رساند یا خطے ہمراہ

خود بیار و از رے نشان راستی آں قاصد از طلب مید اشتند چنانچہ در امرا و سلاطین
حالا ہم ہمیں مرسوم است کہ فرمانے یا شقہ بدست معتبرے خود میفرستند و برائے تصدیق او
بعض چیز ہائے مخصوص از پالکی و فوج ہمراہ او می دہند پس اہل ایں بلاد را کہ دیار عرب است
طریق ہدایت ہمیں طور مقرر شدہ و ہند دراچوں ایں طریقہ معتمد علیہ نبود بلکہ ظہور حضرت حق را
در بعض چیز ہا و تکلم بزبان حق باصدور افعالے کہ مخصوص بمرتبہ الوہیت است از خوارق عادات
و حکم رانی در مخلوقات نیابت حق می دانستند، لہذا بایشاں ہمیں وضع معاملہ واضح شد و بید ہا
فرستادند تا مدت دراز قیام ہدایت ایشاں ہمیں اسلوب ماند چنانچہ از جوگ باسشٹ و رامائن
و مہا بھارت معلوم می شود تا آنکہ بیاس نام شخصے پیدا شد و باغوائے شیطانی تمام مذاہب
آنہا را برباد داد و شرک و بت پرستی رائج گرد و بعد از آں ہمہ ہندوان مشرک شدند و صورت پرستی
پیش نہادند......... بالجملہ اوتار ہند و مظاہر حق گذشتہ باشند خواہ از افراد بشر
باشد خواہ از غیر وماہی مثل عصائے حضرت موسیٰ و ناقہ حضرت صالح لیکن عوام ایں فرقہ
بسبب قصور فہم درمیان ظاہر و مظہر فرق نکردہ ہمہ را معبود ساختند و در ضلالت افتادند
و ہمیں است حال فرقہ ہائے بسیار از مسلمین مثل تعزیہ سازاں و مجاوران قبور و جلالیاں
و مداریاں واللہ اعلم بحقیقۃ الحال " (فتاوی عزیزی ج اول ص ۱۳۳ و ۱۳۴)

اس سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں:

(۱) ہندوستان میں بھی پیغمبر مبعوث ہوئے، لیکن ان کی بعثت کی شکل عرب کے پیغمبروں کی بعثت کی شکل سے مختلف تھی اور ہندوؤں کے ذوق اور رواج کے مطابق خدا کا ظہور کسی پیکر میں ہوتا تھا جو خدا کی زبان سے باتیں کرتے اور ان سے ایسے افعال صادر ہوتے تھے جو خدا کے ساتھ مخصوص ہیں۔

(۲) ہندوستان کی قدیم مذہبی کتابوں میں توحید کی تعلیم تھی جو بعد میں بت پرستی سے بدل گئی۔

اور ہندو عوام اپنے قصور فہم کی بنا پر ظاہر اور مظہر میں فرق نہ کر سکے اور شرک و بت پرستی میں مبتلا ہو گئے جس کی مثال مسلمانوں میں تعزیہ ساز، قبروں کے مجاور اور مداری و جلالی فرقے ہیں۔

جب ہندوؤں میں پیغمبروں کی بعثت اور ان کی قدیم کتابوں میں توحید کی تعلیم مسلم ہے تو خواہ ان کے عوام کتنے ہی شرک و بت پرستی میں مبتلا ہوں، اور ان کا شمار اہل کتاب میں اس لیے نہ کیا جا سکے کہ ان کے پیغمبروں اور کتابوں کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے تب بھی ان کے شبہ اہل کتاب ہونے میں شبہہ نہیں، اسی لیے عربوں نے سندھ کے ہندوؤں کو شبہ اہل کتاب قرار دیا تھا۔

ہندو مذہب پر موقوف نہیں ہے، قدیم مذاہب میں کوئی مذہب بھی بت پرستی یا کم سے کم شرک سے خالی نہیں ہے، حتیٰ کہ عیسوی مذہب میں بھی جو الہامی مذہب ہے اور عیسائیوں کا شمار اہل کتاب میں ہے، تثلیث کا عقیدہ صریحی شرک ہے، رومن کیتھلک تو حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم علیہا السلام کے بتوں کی پرستش کرتے ہیں، توحید خالص سے سب سے پہلے اسلام نے دنیا کو آشنا کیا، اس موقع پر اقبال کے یہ حسب حال اشعار یاد آ گئے،

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر	کہیں مسجود تھے پتھر کہیں معبود شجر
خوگر پیکر محسوس تھی انساں کی نظر	مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیونکر
تجھ کو معلوم ہے لیتا تھا کوئی نام ترا	قوت بازوئے مسلم نے کیا کام ترا
محفل کون و مکاں میں سحر و شام پھرے	مے توحید کو لیکر صفت جام پھرے
کوہ میں دشت میں لیکر ترا پیغام پھرے	اور معلوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرے

مسلمانوں میں بڑی حد تک توحید اسلیے محفوظ رہ گئی کہ اللہ تعالیٰ نے انکی کتاب کو ہر طرح کی تحریف سے اور انکے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور اعمال و اقوال کو محفوظ رکھا، اور ان میں وقتاً فوقتاً مصلحین بھی پیدا ہوتے رہے، جو اسلام کو ہر وثنی آمیزش سے پاک کرتے رہے، اسلیے اس گئی گذری ہوئی حالت میں بھی مسلمانوں میں توحید کا جو تصور اب تک ہے وہ دنیا کی کسی قوم میں نہیں ہے۔

شبلی

انسان، مصنّف، مصنّف گر

از

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

(یہ مقالہ جوبلی کی علمی نشست میں پڑھا گیا)

پچاس سال! پچاس سال، اور وہ بھی ہجری نہیں، عیسوی. نصف صدی، اور وہ بھی قمری نہیں شمسی! مدت کچھ تھوڑی ہوئی! اللہ اکبر! عمریں بیت گئیں، ایک نہیں دو دو پشتیں گزر گئیں. بچے بوڑھے ہوگئے، اور جوان، بوڑھے پھوس ہو کر رہے! جو کنوارے تھے، وہ پوتوں والے ہوگئے. اور جن کے قد تیر کی طرح سیدھے تھے، وہ جھک جھکا کر کمان بن گئے! تاریخ اور جنتری سے پوچھئے، تو یہ جواب پائیے، اور یہ حساب سنیے. لیکن غفلت کی تھپکیوں میں اگر آجائیے، اور پھر دو سا محض اپنی یادداشت پر رکھیے، تو ایسا لگنے لگے کہ جیسے ابھی کل ہی کی تو بات ہے. ۱۴ء و ۱۵ء کو دن ہی ابھی کے گزرے ہیں. کل رات ہی کا تو خواب ہے! وہ دیکھیئے دار المصنفین کا خاکہ تیار ہو رہا ہے، دستور العمل بن رہا ہے، مجلس انتظامی کے رکن ملک بھر سے چھانٹ چھانٹ کر لیے جارہے ہیں، ہونہار اور نو عمر رفیق چنے جارہے ہیں. علم و قلم کی بساط پر ایک نئی مجلس مرتب ہو رہی ہے. تحقیق و تصنیف کی مسند پر جلوہ آرا ہو رہے ہیں سید سلیمان ندوی یا ایک ہیچمدان کی زبان میں سلیمان اعظم. اور انتظام، عمارت، طبع و اشاعت کے سرلشکر بنے ہوئے ہیں انھیں کے

رفیق و صدیق، ہمدم و ہم قدم، مولوی مسعود علی ندوی، یا ایک بے ادب کی زبان میں، سالار مسعود غازی!

کیا زمانے تھے، کیا جوش تھا، اور کیسے بلند جذبات تھے! کیا کیا حوصلے، کیا کیا ولولے!
اور سب سے بڑھ کر ایک عزم صمیم. کام کی دھن. خدمت کی لگن!

اور یہ ساری آگ لگائی ہوئی اور روشنی پھیلائی ہوئی کس کی تھی؟ ایک بڑے میاں کی. جو ستر اور اسّی کیا معنی، ابھی ساٹھ برس کے بھی نہیں ہونے پائے تھے کہ "بڑے میاں" بن گئے تھے. ابھی اپنی بھرپور جوانی ہی میں تھے، کہ ملک بھر پر اپنا سکہ بٹھا چکے تھے. علامہ کہلانے لگے تھے. اور علوم و معارف کی مشعل ہاتھ میں لیے ہوئے ہزاروں دماغ روشن کر چکے تھے. تو ذرا ۲۰-۲۵ منٹ کا وقت نکال، اسی مرد خدا کی داستان حیات کی کچھ سطریں پڑھ ڈالیے. داستان کچھ اُس کی شخصیت کی، اور کچھ اس کی کارگذاری کی، اُس کی کاریگری کی. کہانی ناتمام سہی، ادھوری سہی، سرسری سی. بلکہ یوں کہیے اُڑی پڑی سی

(۱) شخصیت

اپنے ہوش کی آنکھیں ابھی کچھ کھل چلی ہی تھیں، اور زمانہ انیسویں صدی عیسوی کے ختم اور بیسویں صدی کے شروع ہونے ہی کا تھا کہ کانوں میں نام مولانا شبلی کا عظمت و توقیر کی راہ سے پڑنے لگا. اکثر حالی کے ساتھ عطف ہو کر، اور کبھی ان سے ہٹ کر، بلکہ کبھی کٹ کر بھی. شہرت یہی سننے میں آئی کہ مولانا علم و فضل کے پیکر ہیں، ایک فاضل ہمہ داں اور تاریخ کے بحر بیکراں. نثر کے تاجدار، تو نظم کے بھی شہسوار. کچھ اور تمیز آئی، تو الندوہ باقاعدہ پڑھنا شروع کر دیا، اور اس نے مولانا کے علم و فضل کا نقش دل پر اور گہرا کر دیا. ۷ء میں والد ماجد کے ہمراہ لکھنؤ میں دار العلوم ندوہ کے جلسۂ دستار بندی میں شرکت کی. اور وہیں پہلی بار مولانا کی زیارت کے ساتھ دو کتابیں بھی مولانا کی خرید کر لیں. ایک ان کی معروف متکلمانہ کتاب الکلام، دوسری تاریخی رسائل شبلی.

نویں درجہ کے اسکولی طالب علم اور ۱۴، ۱۵ کے سن کے لڑکے کی بساط ہی کیا تھی۔ کتابیں پڑھیں اور تھوڑی بہت سمجھیں، تو آنکھیں کھل گئیں، اور ایک عالم ہی دوسرا نظر آنے لگا۔ الکلام میں علمی، کلامی، فلسفیانہ بحثیں وجود باری، رسالت، معجزات، عقیدۂ آخرت پر تھیں۔ اور رسائل میں بعض بڑے معرکہ کے تاریخی مسئلوں کا حل تھا۔ مضمون اس کے سارے ہی اہم تھے، لیکن یہ تین مقالے تو دل کی گہرائیوں میں اتر گئے، اور دماغ پر نقش ہو گئے۔ ایک کتبخانہ اسکندریہ، دوسرے حقوق الذمیین، تیسرا جزیہ کی تحقیق۔ دونوں کتابوں کے لکھنے والے سے عقیدت گہری سی گہری پیدا ہو گئی۔ اور اب الندوہ کا انتظار ہر مہینے بے تابی سے رہنے لگا۔ اورنگ زیب عالمگیر پر الندوہ میں قسط وار مضمون سونے پر سہاگے کا کام کر گیا۔ سوتے جاگتے شبلی ہی کا خیالی پیکر نظر کے سامنے رہنے لگا۔ سال ہی ڈیڑھ سال بعد، کالج میں پڑھنے کے لیے لکھنؤ منتقل ہو آیا۔ اور ۰۸ء کی دوسری ششماہی کی کوئی تاریخ ہو گی، جب اپنے بڑے بھائی کے ساتھ علامہ کی خدمت میں حاضری کا اتفاق ہوا۔ اف وہ پہلی اصالۃً[1] حاضری! کتنی مودبانہ، کتنی عقیدتمندانہ اور کیسی پرستارانہ تھی! نام بتانے اور معمولی سے سوالوں کے جواب دینے میں زبان لڑکھڑانے لگی، ہمت جواب دے دے گئی —— خیر اس پہلی ملاقات کے بعد راہ کھل گئی۔ اور شروع شروع تو آمد و رفت، رُک رُک کر کئی کئی دن بعد ہوتی رہی، پھر جلد ہی جلد ہونے لگی۔ کبھی تنہا اور کبھی اُس وقت کے رفیق خصوصی مولوی عبد الباری ندوی کے ساتھ۔ ملاقات کا عام وقت سہ پہر کا تھا۔ ادھر سہ پہر ہوا اور ادھر قدم خود بخود آستانِ شبلی کی طرف اٹھ گئے۔ اُس وقت مولانا کی حیثیت گویا پیر و مرشد کی تھی۔ سیاست ہو یا مذہب، شاعری ہو یا ادب، تاریخ ہو یا فلسفہ، علم و فن کے ہر شعبہ، ہر شاخ میں مرجعیت انھیں کو حاصل تھی، وہ امام میں مقلد، وہ رہنما میں مسافر، وہ طبیب میں مریض۔ مولانا کا قیام اپنی وفات (نومبر ۱۹۱۴ء) سے کچھ قبل تک

[1] اصالۃً اس لیے کہ والد ماجد کے ہمراہ تبعاً تو مارچ ۰۸ء ہی میں حاضری ہو چکی تھی۔

عموماً و بیشتر لکھنؤ ہی میں رہا۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی لمبی مدت کے لیے وہ بمبئی، حیدر آباد وغیرہ بھی آتے جاتے رہے۔ اسی درمیان میں ایک دور وہ بھی آیا، جب مغربیت کے اثر سے میرے اوپر نشہ الحاد کا سوار ہو گیا۔ اور مِل، اسپنسر، ہکسلے وغیرہ کے بھرے میں آ کر میں مذہب ہی سے منحرف ہو گیا۔ فخر بجائے اسلام کی حلقہ بگوشی کے "ریشنلزم" یا عقلیت اور لاادریت پر کرنے لگا۔

اور مذہب پر کچھ زور نہ چلا، تو ساری جھنجھلاہٹ شبلی کی الکلام ہی پر اتار دی۔ قلم چلانے کی الٹی سیدھی مشق مولانا ہی کے فیض سے ہو گئی تھی، پہلا ہاتھ انھی پر صاف کیا۔ کئی کئی نمبر الکلام کی رد و قدح میں لکھنؤ کے ایک ماہنامہ میں چہرہ پر ایک طالب علم کا نقاب ڈال، لکھ ڈالے۔ حاضری کے معمول میں فرق کچھ تو اسی زمانہ میں قدرۃً آیا، لیکن بہت زیادہ اُس زمانہ میں بھی نہ آنے پایا۔ یہ نیازمندی تو ادھر سے تھی۔ اُدھر مولانا کی بزرگانہ شفقت تھی کہ لکھنے والے کا نام جان لینے کے بعد بھی نہ ہٹی نہ گھٹی۔

مولانا نے مکان اس درمیان میں کئی بدلے، کم سے کم دو تو گولہ گنج ہی کے آس پاس۔ اور پھر جب امین آباد میں گھنٹہ گھر پارک تیار ہو گیا، غالباً ۱۱ء میں تو اسی کے بالاخانہ پر منتقل ہو آئے۔ سیرت نبویؐ کا جب مستقل کام ۱۲ء میں شروع کیا، تو ضرورت ایک چلتے ہوئے انگریزی مددگار کی ہوئی، جو انگریزی ماخذوں سے معلومات تلاش کر کے اور ترجمہ کر کے پیش کرتا رہے۔ اس خدمت پر تقریباً گھنٹے دو گھنٹے روزانہ کام کے لیے ماہانہ معاوضہ پر اسی خاکسار کا کیا۔ (بی۔ اے کی سند اسی سال حاصل ہوئی تھی) اور اس تقریب سے حاضری اور ہم نشینی کے موقعے اور زیادہ ملنے لگے، اور وقت کے علاوہ بے وقت، بلکہ ناوقت بھی۔ اور جب مولانا سفر میں تشریف لے جاتے تو مراسلت بھی پابندی سے جاری رہتی۔ جلوت کی صحبتوں کے ساتھ خلوت میں بھی بیٹھنے اٹھنے کے موقعے ملنے لگے۔ اور انگریزی حکام سے مولانا کی خط و کتابت ہوتی رہتی۔ اس خدمت کا بھی اہل اس نااہل کو سمجھ لیا گیا۔ ندوہ کے معاملات میں دوسروں سے جو

ذرک جھونک چلی جاتی، اس میں بھی ایک حد تک دخیل اپنی طالبعلمانہ حدود کے اندر ہوگیا ـــــ صیغۂ متکلم کے باربار اور سامعہ خراش استعمال سے عجب نہیں کہ طبیعت اکتا چلی ہو، تو غرض اس ساری دراز نفسی سے یہ ہے کہ علامہ کی شخصیت پر جو گذارشیں پیش ہو رہی تھیں، ان کی بنیاد زنی سنائی باتیں ہیں، نہ واسطہ در واسطہ روایتیں، بلکہ بہت کچھ براہ راست دیکھا سنا ہوا ہے، اور "شنید" سے بڑھ کر "دید" کا حصہ ہے۔

اس زمانہ میں مولانا تجرد کی زندگی بسر کر رہے تھے، اہل خانہ وفات پا چکی تھیں، اور صاحبزادہ کہیں ملازمت پر تھے، مکان کے مکین بس مولانا خود تھے، اور ایک افیونی نما خدمت گار، کہ وہی کھانا بھی پکا دیتا تھا۔ اور کھانا پکنا ہی کیا تھا، بڑے کم خور تھے۔ جوانی میں سنا ہے کہ شہ زور تھے، اور عجب نہیں کہ خوش خور بھی ہوں، مگر اب تو غذا بہت ہی قلیل رہ گئی تھی۔ معمولات روزانہ یہ تھے کہ رات میں سویرے ہی سو جاتے، اور ادھر بہت تڑکے منہ اندھیرے اٹھ بیٹھتے۔ صبح چائے کا معمول اسی وقت کا تھا۔ خدمتگار صاحب کو یہی ڈیوٹی کھل کر رہتی۔ مولانا چائے کے رسیا تھے اور چائے سے بھی بڑھ کر شکر کے۔ شکر دان میں دانہ دار شکر سامنے رکھی ہوئی ہے، اور مولانا اس سے شغل فرماتے جاتے ہیں۔ قلم میں شیرینی چاہے کچھ اسی شکر خوری سے آگئی ہو، لیکن بھوک پر تو بڑا ہی برا اثر شکر اور چائے کی اس افراط کا پڑتا تھا۔ ابھی کچھ اندھیرا ہی ہوتا کہ لیمپ جلا کر بیٹھ جاتے، اور لکھنے کا کام صبح کے دو گھنٹے کے اندر کر ڈالتے۔ دن کا بڑا حصہ کتابوں کے اوراق کی الٹ پلٹ کی نذر ہوتا۔ مطالعہ کے شوقین نہیں، حریص تھے۔ دن کا کھانا اول ہی وقت کھا لیتے۔ شام کے کھانے سے اخیر زمانے میں مغرب سے پہلے ہی فراغت کر لیتے، اکثر ہم بیٹھنے والوں کے سامنے ہی، اور کھانا ہوتا کیا؟ امین آباد کے چٹپٹے کباب سیخ، ایک دو سے زیادہ نہیں، اور کلچے، وہ بھی بس ایک ہی آدھ۔ رساول خوب میٹھی کھاتے اور ایک رساول کیا، ہر مٹھائی خوب ہی تیز چاہتے۔ ریل کے سفر میں اسٹیشنوں

سے مٹھائی خرید خرید کر تناول فرماتے۔

مزاج جذباتی تھا۔ سردی گرمی دونوں کا احساس بڑا نازک رکھتے۔ سردی کی راتوں میں معمولی رضائی، کمل، لحاف، ناکافی ثابت ہوتے۔ لیکن پانی غیر معمولی طور پر ٹھنڈا چاہتے۔ ایک بار کیا ہوا کہ ۱۳ء کے آخری ہفتہ دسمبر میں لکھنؤ میں شب کو غریب خانہ کھانے پر تشریف لائے۔ ایک دوست کی فرمائش پر عزیز لکھنوی اور شہر کے دو نامور ہندوؤں کو بھی بلا لے دیا تھا۔ ایک پنڈت برج نرائن چکبست شاعر، دوسرے پنڈت بشن نرائن بیرسٹر اور کانگریس کے سابق صدر۔ کھانے پر مولانا نے پانی طلب فرمایا، اور جب پیش ہوا تو بولے "برف نہیں ہے"۔ اتنے کڑاکے کے جاڑے میں رات کے وقت کسی کو خیال بھی برف کا ہو سکتا تھا! اور اس وقت تو تلاش سے امین آباد میں بھی نہ ملتی۔ میں شرمندگی سے پانی پانی ہوگیا ـــــ مزاج میں حدت و شدت بھی اسی مناسبت سے تھی، اور شاید اسی لیے رفیقوں سے اکثر آن بن ہی رہتی۔ غم و صدمہ کا اثر بھی قلب بہت محسوس کرتا ـــــ چھوٹے بھائی اسحٰق مرحوم تو خیر سگے بھائی ہی تھے، ان کی وفات نے مولانا کی کمر توڑ دی، ان کا مرثیہ تو وہ مضطر و بیقرار ہو کر کہتے ہی، باقی غیروں کے جو مرثیے انھوں نے کہے ہیں، ان میں بھی سوز و گداز پھٹا پڑتا ہے۔ میرے والد مرحوم کا انتقال ۱۲ء کے اخیر میں مکہ معظمہ میں ہوا۔ میں نے ایک ٹوٹا پھوٹا ماتمی مضمون اس وقت کے ہفتہ وار مشرق (گورکھپور) میں لکھا۔ مولانا نے اسے پڑھا اور نو مشقی کی ساری خامیوں کے باوجود مضمون کی داد اس کی غم انگیزی کی حیثیت سے دی۔ خواجہ حسن نظامی اور پریم چند کے افسانوں میں جو رقت انگیز ٹکڑے آجاتے تھے، مولانا کے آنسو ان پر نکل پڑتے تھے۔ میر انیس کے مرثیوں سے اتنا اثر بھی اسی رقیق القلبی کا اثر تھا۔ محسن الملک مرحوم، جسٹس سید محمود مرحوم کی وفات اور مدار المہام رامپور جنرل عظیم الدین خاں کے واقعۂ قتل سے قلب نے بڑا اثر لیا تھا، اور اس کا اظہار زبان یا قلم سے

نظم میں یا نثر میں ہو کر رہا۔

اپنے معاصرین میں حالی کے بڑے معترف رہا کرتے۔ میں علامہ کے اور کمالات کا قائل تو تھا ہی، لیکن ان کی سخن فہمی کو اپنا جزو ایمان بنائے ہوئے تھا۔ اور معمول کچھ ایسا بنا لیا تھا کہ جب کوئی شعر پسند آجاتا تو اسے کسی نہ کسی بہانے مولانا کے کان تک پہنچا دیتا، اب اگر کہیں انھوں نے داد دے دی، یا میرے انتخاب پر صاد کر دیا، تو جیسے مجھے سب کچھ مل گیا۔ لیکن اگر کہیں انھوں نے خاموشی یا بے رخی برتی، تو معاً وہ شعر میری نظر سے بھی گر جاتا —— ایک بار اپنے دل کی یہی بات بے تکلف گوش گزار کر دی۔ بولے کہ "خیر میرے لیے تو یہ محض حسن ظن ہے۔ البتہ مولانا حالی کا درجہ سخن فہمی میں واقعی ایسا ہی ہے۔ اور میں ان کے ساتھ یہی معاملہ رکھتا تھا۔"

عالی ظرفی کی ایک متعین مثال اس سے اونچی سنیے۔ ثاقب اکبر آبادی ثم لکھنوی کا شمار لکھنؤ کے اہل زبان میں تھا۔ سنہ ۱۳ء میں مولانا نے مسجد کانپور کے مشہور حادثہ سے متعلق نظم کہی۔ مضمون ایک جگہ پولس کی گولیوں سے بوڑھوں اور بچوں دونوں کی شہادت کا تھا۔ ایک شعر موزوں یوں ہوا تھا ؎

عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
یہ لڑکے ہیں بہت جلد اُن کو سو جانے کی عادت ہے

ثاقب ملنے آئے، تو انھیں سنایا۔ ثاقب نے کہا کہ دوسرے مصرعہ میں اگر دو لفظ بدل دیے جائیں تو مصرعہ اور چست ہو جائے۔ "لڑکے" کی جگہ "بچے" "بہت جلد" کی جگہ "سویرے"۔ مولانا نے بلا تامل اس مشورے کو قبول کر لیا۔ اور اب مصرع یوں ہو گیا ع

کہ بچے ہیں، سویرے اُن کو سو جانے کی عادت ہے

معاصر کی عظمت کا اعتراف ہی کوئی آسان بات نہیں، چہ جائے کہ اس کی اصلاح کو قبول کر لینا۔

اور پھر جب وہ معاصرین میں بھی اپنے سے چھوٹا ہو، اور شہرت میں بھی کمتر ہو۔ یہ انصاف پسندی اور عالی ظرفی ہر ایک کے حصہ میں نہیں آتی۔

دینی غیرت مندی کے پتلے تھے، خود عبادات میں چاہے ڈھیلے ہوں، بعض عقائد کی تاویل میں بھی چاہے عقل پرستوں کی صف میں جا ملے ہوں، لیکن جہاں تک دین کی حمیت و غیرت کا سوال ہے، ان کے قدم کسی بڑے سے بڑے معقولی بزرگ سے پیچھے نہ تھے۔ اور آریہ ہوں یا عیسائی، ملحد ہوں یا مستشرق، طنز و تعریض کی زد کسی سمت سے بھی اسلام پر پڑتے دیکھکر برداشت نہ کر سکتے، اور فوراً جواب کے لیے بےچین ہو جاتے —— سر سید سے سیاسیات میں سخت اختلاف رکھتے، لیکن ذاتی طور پر ان کے بڑے مداح تھے۔ ان کی سیرت و کردار کی پختگی، ان کی اصول پرستی، ان کے ایثار، اور ان کے حُبِ اسلام کی داد برابر دیتے رہتے۔ خود بھی مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی کتنی تجویزیں سوچتے رہتے، کتنے منصوبے بناتے رہتے، اور جہاں تک بس چلتا، ان پر عمل بھی کر گزرتے۔

طبیعت حسن پرست پائی تھی۔ فارسی شاعری میں کھل کھیلتے اور معاملہ بندی کو بڑے لطیف انداز میں سرمستی کی حد تک پہنچا دیتے۔ بمبئی اور جنجیرہ کی تلمیحوں کو تو یار لوگ لے اڑے اور بدگمانی اور مبالغہ کے زور سے سوئی کو بلم بھالا بنا دیا۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ بات سرے سے بے اصل ہو، اور مولانا کی عظمت کا اعتراف کرنے کے لیے آخر یہ کیوں ضروری ہے کہ عمل ہی میں نہیں، بلکہ خیال اور دماغ میں بھی انھیں بےنفس اور معصوم تسلیم کر لیا جائے!

مولانا کا سب سے بڑا وصف ان کا شغلۂ علم تھا۔ کتب بینی ان کی غذا تھی، اور مطالعہ انکا اصلی ذوق۔ انھیں کتب خانہ دے دیا جاتا تو بس اب انھیں نہ کھانے پینے کی پروا تھی، نہ سونے کی۔ ان کا سب سے بڑا راحت کدہ، ان کا کتب خانہ ہی تھا۔ یہ ذوق ان کی اصل طبیعت و سرشت بن گیا تھا۔

اور جوں کہ یہ حال تھا، محض قال نہ تھا، آمد تھی، آورد نہ تھی، اور تکلف و تصنع کو اس میں دخل نہ تھا۔ اس لیے ان کا یہ ذوق متعدی بھی تھا۔ اور دوسروں کو قوت کے ساتھ متاثر کرتا رہتا۔ اور جو انکی صحبت میں اٹھا بیٹھا وہ خود بھی اگر مصنف نہیں، تو مضمون نگار تو بن ہی گیا۔ جمالِ ہم نشیں در من اثر کرد کی تصدیق۔

(۲) مصنّف

شخصیت کی جھلکیاں آپ دیکھ چکے، اب ذرا مصنف پر بھی ایک سرسری، اچٹتی نظر ہو جائے۔

مولانا اپنی جگہ بولنے والے بھی بہت اچھے تھے۔ اور ملک کے اونچے خطیبوں، مقرروں میں گنے جاتے تھے۔ لیکن ان کا اصل جوہرِ کمال خوش تقریری نہیں، خوش تحریری تھی۔ اور انکی شہرۂ آفاق عظمت کا نقیب زبان نہیں، قلم تھا۔ مصنف اردو نے اور بھی اچھے اچھے پیدا کیے ہیں، کسی نے تاریخ نگاری میں نام پایا تو کسی نے ادب و انشا کا جادو جگایا، ایک نے دینیات میں اللہ و رسول کے فرمان سنائے، تو دوسرے نے قصے کہانیوں کے چونچلے دکھائے۔ تنوع یا رنگا رنگی کی دولت شبلی ہی کے نصیب میں آئی۔ تاریخ ہو یا سوانح نگاری، شعر ہو یا نقد شعر، کلام ہو یا فلسفہ، جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اب چاہے چھوٹا سا مقالہ ہو یا بڑی سی کتاب، لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ مستقل کتابیں لکھیں تو اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک دوسرے سے اتنی الگ، جیسے ایک طرف شعر العجم، اور موازنۂ انیس و دبیر۔ دوسری طرف سیرۃ النعمان اور الفاروق، اور الغزالی، اور سوانح مولانا روم اور سب سے بڑھ کر سیرۃ النبی۔ تیسری طرف الکلام اور علم الکلام، چوتھی طرف متفرق مقالے جیسے جزیہ اور کتب خانہ اسکندریہ اور حقوق الذمیین اور مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم۔ بیسیوں کیا پچاسوں کی تعداد میں۔ پانچویں طرف الندوہ میں برسوں تک لکھے ہوئے نوٹ اور شذرے۔ اور سالہا سال تک لکھے ہوئے شاگردوں، عزیزوں، دوستوں کے نام خط۔ چھٹی طرف عربی

میں لکھا ہوا جرجی زیدان کی تنقید و تردید میں الانتقاد۔ چھ سمتوں کے بعد تو اس شش جہت میں کوئی سمت باقی بھی نہیں۔ اس سارے ضخیم دفتر میں جہاں سے جس نوشتہ کو بھی اٹھا کر دیکھ لیجیے، مصنفی کے اونچے معیار سے گرا ہوا آپ نہ پائیں گے۔ اور مصنف کی زبانِ حال یہی صدا لگاتی ہوئی سنائی دیگی

ہے قلم میرا تیغِ جوہر دار

موضوع جو کچھ بھی ہو، تصنیف تالیف بجائے خود ایک فن ہے، جس کے اپنے قاعدے ہیں، ضابطے ہیں، اصول ہیں، فروع ہیں۔ شبلی کو یکتائی فن تصنیف میں حاصل تھی۔ رزم ہو یا بزم، دونوں کا سماں یکساں صحیح کھینچ دینے میں طاق۔ موزوں لفظ، مناسب فقرے، متناسب ترکیبیں لانے میں مشاق۔ استدلال کریں گے، تو ایسا معقول کہ پہلے دہلہ میں تو آپ کا دماغ ان کے ساتھ کھنچ ہی جائے گا۔ رنج کا نقشہ کھینچیں گے تو ایسا کہ آپ پر بھی جذبۂ غم طاری ہوئے بغیر نہ رہے۔ مقامِ مسرت کی مصوری کریں گے تو ایسی، کہ آپ کے دل کا کنول آن کی آن میں کھل ہی جائے۔ شعر کی گرہ کھولیں گے تو ایسی کہ آپ کا وجدان جھوم جھوم اٹھے۔ معرکۂ حرب و ضرب کی تصویر دکھائیں گے تو ایسی کہ خود آپ کی رگِ شجاعت جوش میں آجائے! —— قلم پر یہ قدرت وہ بھی اس ہمہ گیری، اس جامعیت کے ساتھ کمتر ہی کسی مصنف کے نصیب میں آتی ہے۔ پڑھنے والے گویا موم کی گڑیا ہیں کہ لکھنے والے نے جب اور جدھر چاہا ان کی ناک موڑ دی اور انھیں پتا بھی نہ چلنے پایا۔

تصنیف و تالیف جب خود ایک مستقل آرٹ ٹھہرا، تو آرٹسٹ یا فن کار کے لیے لازم آیا کہ اسے ناظرین یا تکمین کی طبیعت پر، جبلت پر، نفسیت پر پورا عبور حاصل ہو۔ عبارت دقیق ہو، ثقیل نہ ہو، سادہ ہو، پھیکی نہ ہو، سلیس ہو، سپاٹ نہ ہو، سنجیدہ ہو، خشک نہ ہو، عام فہم ہو، عامیانہ نہ ہو، لطیف ہو، رکیک نہ ہو، ٹھوس ہو، ٹھس نہ ہو۔ فکر انگیز ہو، بور کر دینے والی نہ ہو، پُر زور ہو، پُر شور نہ ہو،

شبلی اسلوب بیان کی ان باریکیوں کے، اور لطافتوں کے، نزاکتوں کے محرم راز تھے۔ ہر جگہ انھیں خوب برتا ہے۔ اور ان حقیقتوں کو بار بار پرکھ کے دکھایا ہے۔ ایسے ایسے چٹکلے تو جیسے انکی جیب میں پڑے رہتے تھے۔ پھر موضوع پر عبور، اور اس کے لیے پوری تیاری، یہ تو گویا اس فن کی ابجد ہے۔ شبلی جو کچھ کہنا چاہتے تھے، پہلے اس کے متعلق خوب پڑھ لیتے، اس کے مالہٗ و ماعلیہ کو نظر کے دائرہ میں لے آتے، جب جاکر کہیں قلم اٹھاتے —— اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنی تحریر میں خود دار و مخلص تھے، وہی لکھتے، جو واقعی ان کی فہم و بصیرت میں آچکا ہوتا۔ جسے انکا ضمیر قبول کیے ہوتا۔ اپنے قلم کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دی کہ کرایہ کا ٹٹو بن کر رہ جائے، اور جس کا جو جی چاہے فرمائش کرکے ان سے لکھوالے۔

علمی مضمون کو ادا کرنے میں شبلی کے قلم کو اپنے معاصرین میں کاملیت کا شرف حاصل ہے، اور یہ ان کا امتیاز خصوصی ہے۔ اس کی ابتدا بے شک سرسید نے کی لیکن فن کا بانی عموماً فن کا خاتم نہیں ہوا کرتا۔ شمس العلماء مولوی نذیر احمد ان سے چند قدم آگے بڑھے، اور سموات اور مبادی الحکمۃ میں فلکیات و منطق کے ہفتخوان خاصی حد تک سر کر ڈالے لیکن اسے حد کمال پر پہنچانے کا شرف شبلی ہی کے لیے اٹھ رہا تھا۔ کوئی سا بھی علمی مضمون ہو، شبلی کے ہاں عبارت میں کہیں بھی جھول نہ ملے گا اور نہ کہیں سے اناڑی پن کھلنے پائے گا۔ اور یہ شرف معمولی نہیں، غیر معمولی ہے۔ لکھنؤ میں ایک صاحب علم اہل زبان گزرے ہیں۔ ناول اور افسانے میں انھوں نے واقعی قلم توڑ دیے ہیں۔ لیکن ان ہی کا کوئی علمی مضمون، فلسفہ و ریاضی وغیرہ پر اٹھا کر دیکھئے، صاف نظر آجائےگا کہ اس میدان میں آکر وہی قلم فصاحت رقم، شگفتگی، سلاست، حلاوت و فصاحت کی جگہ کیسا تعقید و اغلاق کے دلدل میں پھنس گیا ہے۔ شبلی اس حیثیت سے اپنی نظیر بس آپ ہی گذرے ہیں۔ اب ان کے زمانہ کو بھی اتنا عرصہ گذر چکا، زبان اتنے دنوں میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی،

محاورے بدل گئے، ترکیبیں نئی نئی چل پڑیں۔ لیکن شبلی کے طرز و اسلوب پر اوس اب تک نہیں پڑنے پائی۔ کہنا چاہیے کہ وہی کس بل، وہی دم خم۔ تازگی لیے ہوئے وہی نمونہ اب بھی خاصی بڑی حد تک موجود و محفوظ۔

اور ہاں لیجئے ایک بات تو کہنے سے رہ گئی۔ مذہبیت مولانا کی تصنیفی زندگی پر چھائی ہوئی تھی۔ شعر ہو، ادب ہو، تاریخ ہو، سوانح عمری ہو، کچھ ہو، مولانا متکلم سب سے پہلے تھے اور کچھ اور بعد کو۔ شعر العجم ایک خالص علمی و ادبی کتاب ہے۔ ظاہر ہے کہ شعر عجم کی اس تاریخ و تبصرہ کو مذہب سے کیا واسطہ؟ لیکن نہیں۔ ذرا ملاحظہ ہو کہ گریز سے قبل اس قصیدۂ ضخیم کی تشبیب میں مولانا کا قلم کس رنگ کے موتی پروتا ہے:-

"اسلام ایک ابر کرم تھا، اور سطح خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا لیکن فیض بہ قدر استعداد پہنچا جس خاک میں جس قدر زیادہ قابلیت تھی، اسی قدر زیادہ فیضیاب ہوئی۔۔ ..... جس قوم میں جس قسم کی قابلیت تھی، اسلام نے اس کو اور چمکایا، ترک شجاع تھے، شجاع تر ہوگئے۔ ایران ہمیشہ سے تہذیب، معاشرت اور علوم و فنون میں ممتاز تھے، اسلام نے ان کو ممتاز کر دیا۔"

نثر کے ساتھ نظم بھی شبلی کے قلمرو میں داخل تھی۔ اور اس میں بھی درجۂ اول میں شامل ہونے کی منتظر۔ ان کی فارسی غزلیں اور فارسی قصیدے اور دوسری فارسی نظمیں ہیں۔ لیکن قسمت نے اس باب میں جس طرح غالب کو، خواجہ عزیز لکھنوی کو اور دوسرے فارسی گویوں کو محروم رکھا، شبلی کے ساتھ بھی انصاف نہ کیا۔ ایران میں ان کے کلام کی پرسش نہ ہوسکی۔ اور پرسش کیوں، یہ کہیے کہ وہاں تک اس کی رسائی ہی نہ ہوسکی۔ اور یہ کام اب ہماری یونیورسٹیوں کے شعبۂ فارسی کا ہے کہ وہ جس طرح بھی بن پڑے شبلی کے فارسی کلام کو تو ایرانی دانش گاہوں تک پہنچائیں۔

اردو میں مولانا کی جو چند اِنی گنی غزلیں ہیں، وہ اُن کے ابتدائی زمانہ کی ہیں۔ اور ان کی فارسی غزلوں کی ٹکر کی نہیں، پھر بھی ایسی بھی نہیں کہ سرے سے ذکر ہی کے قابل نہ ہوں۔ گنتی کے چار شعر جو زبانی یاد رہ گئے، ان سے رنگِ کلام کا اندازہ کر لیجئے ؎

(۱) کچھ تو ہو چارۂ غم بات تو یکسو ہو جائے — تم خفا ہو تو اجل ہی کو میں راضی کر لوں

(۲) پاسِ ادب سے رہ گئی فریاد کچھ اُدھر — میں کیا کہوں کہ عرش بریں کتنی دور تھا

(۳) تڑپنے کو ہمارے عرصۂ حشر — بھلا ہوتا ہے کیا اتنی زمیں سے

(۴) شبلی کا گھر بھی خانۂ دشمن کے پاس ہے — محشر خرام اور بھی دو اک قدم سہی

آخر زمانے میں مولانا نے "کشاف" کا نقاب چہرہ پر ڈال، نظمیں بہت ساری کہہ ڈالیں سب کی سب سیاسیات اور وقت کے چلتے ہوئے مسئلوں سے متعلق۔ اور یہ مولانا ابو الکلام کے ہفتہ وار الہلال کے افق پر طلوع ہوتی رہیں۔ زیادہ تر مزاحیہ رنگ میں ہیں، اور کچھ طنزیہ بھی ہیں، اپنی نوعیت میں سب کی سب خوب۔ ایک مشہور نظم جنگ طرابلس کے سلسلہ میں ہے، اور ایک دردناک مرثیہ اپنے بھائی کی وفات پر۔ کچھ اور نظمیں مذہبی، اخلاقی عنوانوں پر اس دور سے بہت پہلے کی ہیں علی گڑھ کے زمانۂ قیام کی۔ ایک قومی مسدس بھی ہے۔ تیسرے درجہ کی چیز ان میں سے کوئی بھی نہیں۔ لیکن مولانا کے اردو سرمایہ میں سب سے قیمتی ان کی ایک مثنوی ہے مختصر سی، کل بیس صفحہ کی، صبح امید کے نام سے، سنہ ۱۸۸۴ء یعنی مولانا کے ابتدائی دور کی لکھی ہوئی۔ بہ قامت کہتر، بہ قیمت بہتر کی ایک چمکیلی مثال۔ مثنوی کا مضمون نہ فاسقانہ، نہ عاشقانہ، نہ افسانوی، نہ رومانوی، تمامتر قومی یا ملّی ہے۔ لیکن موضوع کی سنجیدگی کے باوجود ایسی بانکی، ایسی سجیلی، ایسی البیلی کہ گلزار نسیم کی ہم ادا اور ترانۂ شوق[1] کی ہم نوا۔ سرسید اور ان کی تحریکِ اصلاح پر ہے، اور مثنوی گلزار نسیم

[1] شوق سے مراد احمد علی شوق تھے، جن کی یہ مثنوی اسی زمانہ میں نکلی تھی اور گو آج گمنام ہے، لیکن اس وقت ہاتھوں ہاتھ لی گئی تھی۔

کی بحر میں۔ یہ دُھن اُس وقت چلی ہوئی تھی، اور مولانا اس مثنوی کے خصوصی قدر دانوں میں تھے۔ زیادہ سنانے کا تو موقع نہیں، لیکن دس پانچ شعر تو اِدھر اُدھر سے سنتے ہی چلئے۔ مولانا کے ترنم میں نہیں، محض تحت اللفظ۔

قوم مرحوم کا تعارف کراتے ہیں ؎

وہ قوم کہ جان تھی جہاں کی — جو تاج تھی فرقِ آسماں کی

تھے جس پہ نثار فتح و اقبال — کسریٰ کو جو کر چکی تھی پامال

گل کر دیے تھے چراغ جس نے — قیصر کو دیے تھے داغ جس نے

وہ نیزۂ خوں فشاں کہ چل کر — ٹھہرا تھا فرانس کے جگر پر

روما کے دھوئیں اڑا دیے تھے — اٹلی کو کنوئیں جھنکا دیے تھے

ماضی یہ تھا۔ رفتہ رفتہ ملکوں اور اقلیموں کے ساتھ علوم و فنون کی دولت بھی اس قوم کے ہاتھ سے نکل چکی اور اب یہ حال ہو گیا کہ ؎

معقول کو، فقہ کو، ادب کو — ہم ہاتھ سے کھو چکے ہیں سب کو

بیہودہ فسانہائے پارین — زلف و خط و خال کے مضامیں

وہ نوکِ مژہ کی نیزہ بازی — وہ ترکِ نگہ کی فتنہ سازی

یہ طرزِ خیال تھا ہمارا — یہ فن یہ کمال تھا ہمارا

جغرافیۂ وجود سارا — ہر چند کہ ہم نے چھان مارا

کی سیر ہی گرچہ بحر و بر کی — لیکن نہ خبر ملی کمر کی

نالوں کے دکھائے جب تماشے — گردوں کے اڑا دیے پرخچے

یہ عالم یاس تھا کہ ایک طرف سے رہبر کی آواز آئی ؎

دیکھا تو وہاں بہ جاہ و تمکیں — آیا نظر ایک پیر دیریں
صورت سے عیاں جلالِ شاہی — چہرے پہ فروغِ صبح گاہی
وہ ریش دراز کی سپیدی — چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
پیری سے کمر میں اک ذرا خم — توقیر کی صورتِ مجسم

کلام میں کچھ مزہ اگر آیا ہو، تو یہ بے مزہ حقیقت بھی سن لیجیے کہ آگے چل کر مولانا اس مثنوی سے ایسا بیزار ہوئے کہ اسے اپنی تصنیفات کی فہرست ہی سے خارج کردیا! — عجب نہیں کہ جب عقیدت سرسید سے گھٹی تو رفتہ رفتہ یہ مثنوی بھی نظر سے گرگئی۔ بہر حال وجہ یہ ہو یا کچھ اور، ماننا یہ پڑتا ہے کہ شاعر یا نقاد کے لیے ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ اپنے حق میں انصاف ہی کرتا رہے، ناانصافی اور سخت ناانصافی کبھی وہ اپنے کلام سے بھی کر بیٹھتا ہے۔

(۳) مصنف گر

مولانا کی عظمت کے لیے یہی کیا کم تھا کہ وہ اردو کے عظیم ترین مصنفوں میں سے ایک ہوئے ہیں لیکن اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ وہ مصنف گر تھے۔ ایک مجسم ٹکسال تھے جس سے مصنف اور اہل قلم ڈھل ڈھل کر نکلتے رہے، جن لوگوں کو انکی اتالیقی اور دستِ شفقت نے تصنیف و تالیف کی اونچی کرسی تک پہنچا دیا، ان کی مکمل فہرست کوئی تیار کرنا چاہے تو اسے خاصی طوالت سے کام لینا پڑے لیکن چند نام لے دینے تو بہر صورت واجب ہیں۔ اور چند کیا معنی، جو نام سر فہرست ہے، وہ ایک ہی ایسا ہے، جو شاگرد کے ساتھ خود استاد کا بھی نام چمکا دینے کو کافی ہے۔ اس ایک سے مراد آپ خود ہی سمجھ گئے ہوں گے کہ مولانا سید سلیمان ہیں، جو حقیقی جانشین شبلی اعظم کے رہے، ندوہ اور اس کے دار العلوم ہی کے سیاق میں نہیں، بلکہ اس سے بھی بڑھکر تصنیف و تالیف کے سلسلے میں۔ اور پھر آگے چلئے تو نام عبد السلام ندوی مرحوم اور مولانا عبد الباری ندوی سلمہ اللہ اور ضیاء الحسن علوی مرحوم اور مولوی اکرام اللہ خاں مرحوم، سید ظہور احمد وحشی مرحوم اور حاجی معین الدین مرحوم اور پروفیسر عبد الواجد مرحوم

کے بے ساختہ یاد پڑ جاتے ہیں۔ بلکہ اگر باضابطہ شاگردی کی قید اڑا دیجئے، تو مولانا ابو الکلام مرحوم اور مولانا عبد اللہ عمادی کے سے بزرگوں کے نام بھی اسی صف میں آسکتے ہیں۔ اور اس مقالہ نویس کی تو کچھ پوچھیے ہی نہیں، اس بے علمے کو تو جو کچھ الٹا سیدھا لکھنا لکھانا آیا وہ اسی آستانہ کا فیض ہے۔ پہلے تو انہی حضرت کے مضمون اور کتابیں پڑھ پڑھ کر، اور انکی نقالی میں کمال پیدا کرکے، یہانتک کہ انکی خاص خاص ترکیبیں اور لفظ ازبر ہوگئے تھے۔ اور پھر اسی زندہ بساط کے ایک ادنیٰ حاشیہ نشین بن کر۔

اور لیجئے، یہ سارے نام تو صرف ندوہ کے سلسلے کے ہوئے، باقی ۱۶ سال مولانا نے علی گڑھ میں بھی تو گذارے اللہ جانے کتنے اہل علم و اہل قلم اس علی گڈھی دور میں اسی چشمہ فیض سے سیراب ہوئے ہونگے۔ اب جہانتک خیال پڑتا ہے، اتنے تو شاگرد رشید اس دور میں تو ضرور رہے ہوں گے۔ سید سجاد حیدر، خواجہ غلام الثقلین، مولانا محمد علی، مولوی عزیز مرزا، حسرت موہانی، مولوی ظفر علی خاں اور غالباً میر محفوظ علی بھی۔

شبلی جس پایہ کے سخن گو تھے، اس سے بڑھکر سخن فہم تھے۔ تنقید کا فن جتنا بھی ترقی کر جائے، شبلی نے کلام پر جو بہترین تبصرے اپنی شعر العجم میں کردیے اور اردو کی رزمیہ شاعری اور فن بلاغت سے متعلق جو مبصرانہ نکتے موازنۂ انیس و دبیر میں لکھ دیے ہیں، ان سے کوئی طالب علم چاہے ادبیات فارسی کا ہو یا ادبیات اردو کا، شاید ہی مستغنی ہو سکے۔ اور طالب علم تو خیر منتہی ہو جانے کے بعد بھی طالب علم ہی رہتا ہے۔ ان موضوعوں کے جو اچھے سے اچھے اہل قلم ہیں، وہ بھی ان کتابوں سے روشنی ہی حاصل کرتے رہیں گے۔ اسی طرح جو فلسفہ اور عقلیات پر کچھ لکھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، ان کے لیے بھی مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ الکلام وغیرہ کو دلیل راہ بنائیں۔ اور پھر اس جڑ کو پکڑ کر اس میں پھل پھول جتنے بھی چاہیں پیدا کرلیں۔ واقعات نگاری کے لحاظ سے الفاروق نمونہ کا کام دے گی۔ اور سیرۃ النبی کی تو بعض عبارتیں (خصوصاً ولادت مبارک کے سلسلے میں) اپنی دلکشی، دلآویزی، اثر انگیزی کے لحاظ سے کلاسیکل یا معیاری ہونے کا درجہ پا چکی ہیں۔ سلاست بیان، تحریر کی ان ساری قسموں میں قدر مشترک ہے، اور حسن ترتیب کا جہانتک تعلق ہے، شبلی نے دماغ ایسا پایا تھا جیسا شاہجہان

نے تعمیر کیے۔ تاج محل کا تو خیر کہنا ہی کیا، باقی جامع مسجد دہلی، مسجد اجمیر وغیرہ جس شاہجہانی عمارت کو نظر میں لائیے۔ اس کا نقشہ کتنا سڈول اور کیسا سانچے میں ڈھلا ہوا نظر آئے گا۔ شبلی بھی شاید نقشہ اسی طرز و انداز کا اپنی ہر تحریر کا، چھوٹی ہو یا بڑی اپنے دماغ میں تیار کر لیتے تھے، اور رفتہ رفتہ یہ چیز ان کے لیے ایک امر طبعی بن گئی تھی۔ کسی خاص غور و فکر، سوچ بچار کی ضرورت ہی انھیں نہ پڑتی۔ خود بخود ڈھلا ڈھلایا خاکہ ان کے ذہن میں آجاتا، اور آگے قلم روانی سے چلنے لگتا۔ ہر تحریر کی جان حسن ترتیب ہوتی ہے، شبلی کے ہاں اسکی کیا کمی۔ تفریط نہیں، افراط نہیں۔ ہر بات اس نفسیاتی ترتیب کے ساتھ بیان کرتے، کہ سیدھی دل میں اتر جاتی، ذہن پر بار کہیں سے نہ پڑنے پاتا۔ اور پڑھنے والا تو نیم مسحور سا ہو کر ان کا ہم خیال بن ہی جاتا۔ شرافت اور متانت یہ دو وصف تو جیسے شبلی اپنے قلم کے ساتھ لیے ہوئے پیدا ہوئے تھے۔ ہزاروں صفحے ان کی تحریروں کے پڑھ جائیے، اور ان میں تحریریں ہر دور کی، اور ہر موضوع پر۔ نہ کہیں کوئی لفظ مبتذل ملے گا، اور نہ کہیں کوئی ایسا محاورہ یا ایسی ترتیب جس کا بولنا ثقہ زبانوں پر بار ہو، جس کا سننا شریفوں کے لیے باعث عار ہو!

شبلی، روح پُر فتوح والے شبلی! تو خوش ہو کہ آج تیری یاد منانے کے لیے ملک و ملت کے اتنے چیدہ و منتخب خوش مذاق علم دوست، بوڑھے اور جوان، تیرے مزار پر اور تیرے تصنیف کدہ پر جمع ہوئے ہیں۔ تو جو چراغ جلا گیا، اس سے بے شمار چراغ آج تک جل چکے ہیں، اور آیندہ بھی برابر جلتے رہیں گے۔ رحمت کے فرشتے ان کی عقیدتمندانہ سرگرمیاں تجھ تک پہنچا دیں گے۔ تو مصنف ہی نہ تھا، مصنف گر تھا۔ عالم ہی نہ تھا، معلم بھی تھا۔ تاریخ نگار ہی نہ تھا، تاریخ ساز بھی تھا۔ تجھے حق تھا کہ دارالمصنفین سا ادارۂ تصنیف و تالیف تو قائم کر جا۔ اور دارالمصنفین کا حق ہے کہ وہ تیری یاد کی شمع روشن رکھے، اور تیری ہی راہ پر چل کر ملت و ملک دین و علم کی خدمت اسی طرح بجا لاتا رہے!

علامہ جلال الدّین سیُوطیؒ

از جناب مولانا عبدالحلیم صاحب چشتی فاضل دیوبند

(۲)

املائے لغت

لغت علامہ سیوطی کا خاص فن تھا، اور اس فن میں ان کو امامت کا درجہ حاصل تھا، انھوں نے اس فن میں بھی امالی کا سلسلہ جو عرصہ سے مردہ ہو چکا تھا، دوبارہ زندہ کرنا چاہا، اور املاء کی مجلس بھی منعقد کی، مگر طلبہ کی بے رغبتی کو دیکھکر پہلی ہی مجلس کے بعد اس سلسلہ کو بند کر دیا، جو آج تک بند ہے۔ کتاب المزہر میں طریقۂ املاء پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-

ولما شرعت فی املاء الحدیث	جب ۸۷۲ھ میں میں نے املاء حدیث کا
سنة اثنتین وسبعین وثمانمائة	سلسلہ شروع کیا تو میں نے چاہا کہ املاء لغت
اردت ان اجدد املاء اللغة	کے طریقہ کی بھی تجدید کروں اور اس کے
واحییه بعد دثوره فامليت	مردہ ہو جانے کے بعد پھر زندہ کردوں،
مجلسا واحدا فلم اجد له	چنانچہ میں نے ایک مجلس میں کچھ املا بھی کرایا!
حملة ولا من یرغب فیه فترکته[1]	مگر اس سے استفادہ کرنے والا نہیں پایا
	اور اس کا طلبگار اور خواہاں نہیں دیکھا
	ناچار اس سلسلہ کو ترک کر دیا۔

[1] ملاحظہ ہو کتاب المزہر طبع دوم، قاہرہ، ج ۲ ص ۳۱۴

افتاء اور اس میں احتیاط

علامہ سیوطی کو تفقہ کی دولت سے بھی حصۂ وافر ملا تھا اور اس فن میں بھی انھیں خاص بصیرت حاصل تھی، درس و تدریس سے قبل اکیس[21] سال کی عمر سے ۸۷۱ھ سے افتاء کے فرائض انجام دینا شروع کیے، مگر احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب تک بزعم خویش اصحاب ترجیح میں رہے، ترجیح نووی سے آگے نہیں نکلے اور جب اجتہاد کا ملکہ راسخ ہو گیا تو بھی فتوے میں شافعی مذہب سے باہر قدم نہیں رکھا، شیخ عبد الوہاب شعرانی المتوفی ۹۷۳ھ موصوف سے ناقل ہیں؛

ولما بلغت رتبة الترجيح لم اخرج	جب میں مرتبہ ترجیح کو پہنچا تو افتا میں ترجیح
فی الافتاء عن ترجیح النووی ولما	نووی سے آگے نہیں نکلا اور جب اجتہاد
بلغت الی مرتبة الاجتهاد المطلق	مطلق کے مرتبہ کو پہنچا تو افتاء میں مذہب
لم اخرج فی الافتاء عن مذهب	شافعی سے باہر نہیں گیا۔
الشافعی	

فن افتاء میں ان کی مہارت و وسعت نظر کا اندازہ ان کی کتاب الحاوی للفتاوی سے ہو سکتا ہے جس میں کم و بیش بیاسی[82] رسالے ہیں جن میں فقہ، حدیث، تفسیر، اصول، تصوف، نحو و اعراب وغیرہ سے متعلق اہم سوالات کا جواب دیا گیا ہے، اور کمال یہ ہے کہ اگر سوالات منظوم آئے ہیں تو جوابات بھی نظم میں دیے گئے ہیں۔

بایں ہمہ تبحر علمی فتوے دینے میں احتیاط و خشیت کا ایسا غلبہ رہتا تھا کہ فتویٰ دیتے وقت بارگاہ الٰہی میں حاضری کا منظر ہمیشہ ان کی نگاہ کے سامنے رہتا تھا، نواب صدیق حسن قنوجی، اتحاف النبلاء میں طبقات کا شعرانی کے حوالہ سے رقم طراز ہیں:

"و از ہر مسئلہ کہ جواب می گویم موقف خود را روز حساب و عرض آں جواب بر خود یاد می کنم"[1]

[1] ملاحظہ ہو اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء والمحدثین مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۸ھ ص ۲۹۱

قاضی القضاۃ کے عہدہ پر انتخاب

۹۰۲ھ میں سلطان عبد العزیز نے علامہ سیوطی کو قاضی القضاۃ کا عہدہ سپرد کیا، یوں تو قاضی القضاۃ کا عہدہ ہر حکومت میں تھا، لیکن ایک مملکت میں کئی قاضی القضاۃ ہوتے تھے، پوری مملکت کے قاضی القضاۃ کا عہدہ تاریخ میں صرف دو شخصیتوں کو ملا، دولت بنی ایوب میں قاضی تاج الدین بنت الاعز کو ملا، اور عباسیۂ مصر کے زمانہ میں علامہ سیوطی کو، اس میں قاضی موصوف کے سوا علامہ سیوطی کا کوئی ہمسر نہیں، علامہ موصوف منصف مزاج، انتظام میں سخت گیر تھے، اس لیے جب ان کو یہ عہدہ سپرد ہوا تو پورا ملک حرکت میں آگیا، اور ان کا اثر اتنا بڑھ گیا کہ خلیفہ کو اپنے مصالح کی بنا پر ان کو اس عہدہ سے معزول کرنا پڑا، ان کے تلمیذ خاص مصر کے نامور مورخ ابن ایاس حنفی المتوفی ۹۳۰ھ کا بیان ہے:-

وفیہ من الحوادث ان الخلیفة	۹۰۲ھ کے واقعات میں سے یہ واقعہ بھی ہے کہ
المتوکل علی الله عبد العزیز	خلیفہ متوکل علی اللہ عبد العزیز نے شیخ جلال الدین
عهد للشیخ جلال الدین	سیوطی کو ایک ایسے منصب پر مامور کر دیا جس کے
الاسیوطی بوظیفة لم یسمع بمثلها	متعلق پہلے سے سنا بھی نہیں گیا تھا، اس نے
قط وهو انه جعله علی جمیع	تمام قاضیوں پر ان کو قاضی بنایا اور ان
القضاة قاضیاً کبیراً یولی منهم	سب کے عزل و نصب کا پورا پورا اختیار ان کو
من یشاء ویعزل منهم من یشاء	دیا، یہ ایک ایسا عہدہ تھا جو دولت بنی ایوب
مطلقاً فی سائر ممالک الاسلام	میں سوائے قاضی تاج الدین بنت الاعز[1]
وهذه الوظیفة لم یلیها سوی	کے کسی کو نہیں ملا تھا، جب یہ خبر قاضیوں
القاضی تاج الدین ابن بنت الاعز	کو پہنچی تو ان پر بڑی گراں گزری اور

[1] فقیہ تاج الدین ابو محمد عبد الوہاب بن خلف العلامی الشافعی المعروف بابن بنت الاعز المتوفی ۶۶۵ھ

(باقی حاشیہ ص ۲۰۶ پر)

في دولة بني ايوب فلما بلغ	اور انھوں نے اس معاملہ میں خلیفہ
القضاة ذلك شق عليهم واستخفوا	کو ناسمجھ ٹھہرایا اور کہا کہ خلیفہ کو اقتدار
عقل الخليفة في ذلك وقالوا	کے باوجود حل وعقد اور عزل ونصب
ليس للخليفة مع وجود السلطان	کا اختیار نہیں رہا، خلیفہ کم عمر ہے،
حل ولا ربط ولا ولاية ولا عزل	اس لیے اس کو اقتدار کی قدر
ولكن الخليفة استخف بالسلطان	وقیمت معلوم نہیں، جب
لكونه صغيرا فلما قامت الدائرة	خلیفہ کے خلاف شورش برپا ہوئی،

(بقیہ حاشیہ ص ۲۰۵) کے مرتبہ ومقام کا اندازہ حافظ ابن کثیر المتوفی ۷۷۴ھ کے حسب ذیل بیان سے ہوسکتا ہے وہ لکھتے ہیں :-

كان دينا عفيفا نزها لا تاخذه في الله	وہ دیندار، پاکباز اور پرہیزگار تھے، اللہ کے معاملہ میں
لومة لائم ولا يقبل شفاعة احد وجمع	کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا نہیں کرتے اور نہ کسی کی سفارش
له قضاء الديار المصرية بكمالها	قبول کرتے تھے، پورے دیارِ مصر کی قضا، خطابت،
والخطابة والحسبة ومشيخة الشيوخ	احتساب، مشیخۃ الشیوخ، لشکر کی نگرانی، مدرسہ نجیبیہ،
ونظر الاجياش وتدريس	صلاحیہ میں درس وتدریس کی خدمات اور امامت
الشافعي والصلاحية وامامة	جامع وغیرہ کے سارے منصب ان کو حاصل تھے،
الجامع وكان بيده خمسة عشرة	بیک وقت پندرہ منصب ان کے پاس تھے،
وظيفة وباشر الوزارة في بعض	بعض اوقات وزارت عظمیٰ کے فرائض بھی
الاوقات وكان السلطان يعظمه والوزير	انجام دیے، بادشاہ بھی ان کی تعظیم کرتا تھا
ابن حنا يخاف منه كثيرا	اور وزیر ابن حنا بھی ان سے ڈرتا تھا۔

(البداية والنهاية ج ۱۳ ص ۲۴۹)

والالسنة على الخليفة رجع عن	اور زبان طعن دراز ہوئی تو اس کو اپنے
ذلك وقال ايش انا الشيخ	فیصلے سے رجوع کرنا پڑا، خلیفہ نے کہا میرا
جلال الدين هو الذي حسن لي	اس میں کیا ہے، شیخ جلال الدین ہی نے
ذلك وقال لي هذه لا كانت	مجھ سے اس عہدہ کی تحسین کی تھی اور کہا تھا
وظيفة قديمة وكان الخلفاء	کہ یہ قدیم عہدہ ہے، علما میں سے جس کو
يولونها من يختارونه من	چاہتے ہیں خلفاء اس عہدہ پر مامور کردیتے
العلماء ثم اشهدوا على الخليفة	تھے، پھر لوگوں نے خلیفہ کے اس سے رجوع
بالرجوع عن ذلك وبعثا اخذ	کرنے کی شہادت دی اور اس عہد نامہ
العهد الذي كتبه الشيخ جلال الدين	کو جو اس نے شیخ جلال الدین اسیوطی
الاسيوطي وكادت ان تكون	کو لکھ کر دیا تھا، واپس منگالیا، ورنہ قریب
فتنة كبيرة ذلك ووقعت	تھا کہ بہت بڑا فتنہ پیدا ہوجاتا، اس
امور يطول شرحها ثم سكن	سلسلہ میں اور بہت سی باتیں ہوئیں
الحال بعد مدة[1]	جن کا ذکر موجب طوالت ہے اور ایک

مدت کے بعد حالات پرسکون ہوگئے

بیبرسیہ میں مشیخۃ التصوف کے منصب پر تقرر

۸۹۱ھ میں شیخ جلال الدین بکری کی وفات کے بعد خانقاہ بیبرسیہ میں مشیخۃ التصوف کے منصب پر علامہ سیوطی کا تقرر عمل میں آیا، اس خانقاہ میں انھوں نے کم وبیش تیرہ[13] صدارت کے فرائض انجام دیے، رجب ۹۰۳ھ میں بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر (جن کی تفصیل آگے آرہی ہے) اس خانقاہ کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور وظیفہ خوار صوفیہ کی دارو گیر شروع کی، بعض غیر مستحق صوفیہ کا وظیفہ بند کرکے ان کی جگہ دوسروں کا تقرر کیا، انھوں نے اس اقدام کو سیوطی کے بخل پر محمول کیا اور اپنے حقوق میں دخل اندازی سمجھا جو سراسر

[1] ملاحظہ ہو بدائع الزہور فی وقائع الدہور طبع بولاق مصر جز ۲ ص ۳۰۷

غلط تھا، اس لیے کہ بخل اس وقت ہوتا جب علامہ سیوطی ان کی جگہ پر دوسروں کا تقرر نہ کرتے، انھوں نے ایسا نہیں کیا، بلکہ ان کی جگہ پر مستحق طلبہ کا تقرر کیا اور صوفیہ کو ان کا حق غصب کرنے سے روکا اور مستحق طلبہ کو ان کا حق دلوایا اس جرم میں صوفیہ علامہ کی عزت و آبرو کے درپے ہوگئے اور ان کے جانی دشمن بن گئے، انھوں نے ان کو وضو کے سقاوے میں اٹھا کر پھینک دیا، مورخ ابن ایاس مصری کا بیان ہے:۔

فیہ من الحوادث ان الصوفیۃ الذی بالخانقاہ البیبرسیۃ ثاروا علی شیخھم جلال الدین الاسیوطی وکادوا ان یقتلوہ ثم حملوہ باثوابہ ورموہ فی الفسقیۃ جری بسبب ذالک امور یطول شرحھا

۹۰۳ھ کے واقعات میں ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ خانقاہ بیبرسیہ میں جو صوفیہ قیام پذیر تھے، وہ شیخ جلال الدین اسیوطی پر ٹوٹ پڑے اور قریب تھا کہ وہ ان کو قتل کردیتے۔ انھوں نے ان کو کپڑوں سمیت وضو کرنے کے سقاوے میں پھینک دیا، اس کی وجہ سے بہت واقعات پیش آئے جن کا

شیخ عبدالوہاب شعرانی نے لواقح الانوار القدسیہ میں ان اسباب کی بھی نشاندہی کی ہے، جن کی بنا پر علامہ سیوطی کو صوفیہ کا وظیفہ بند کرنا پڑا، اور یہی وہ اسباب تھے جن کی بنا پر خانقاہ بیبرسیہ کی اصلاح کا بیڑا اٹھانا پڑا تھا، علامہ شعرانی فرماتے ہیں:

لما تولی الشیاخۃ علی الخانقاہ البیبرسیۃ ۔۔۔۔ فانھم لایحضرون لابانفسھم ولا بنائبھم ولھم عبید وبغال وسراری وامواﻝ فقال: شرط الواقف ان الخبز والجوامک انما ھی للفقراء المحتاجین الذین اجتمعت فیھم شروط الصوفیۃ المذکورۃ فی رسالۃ القشیری وغیرھا فتجمعوا علی الشیخ وضربوہ ورموہ فی المیضاۃ بثیابہ فعزل نفسہ وحلف ان لایسکن مصر ماعاش فاقام فی روضۃ مقیاس النیل حتی مات[1]

علامہ سیوطی جب خانقاہ بیبرسیہ میں مشیخۃ التصوف کے عہدہ پر ممتاز ہوئے تو انھوں نے وظیفہ خوار صوفیہ کو نیکی اور خیر خواہی کا حکم دیا کیونکہ نہ وہ خود خانقاہ میں آتے تھے اور نہ ان کے نائب، حالانکہ ان کے پاس غلام اور لونڈیاں تھیں اور وہ سواریاں بھی رکھتے تھے، ان کے پاس مال و دولت بھی تھا اس لیے سیوطی نے ان سے کہا واقف کی شرط یہ ہے کہ روٹی اور کپڑا صرف حاجتمند فقیروں کے لیے ہے، اور اس کے وہی صوفیہ مستحق ہیں جن میں وہ شرطیں پائی جاتی ہیں، جو رسالہ قشیریہ وغیرہ میں مذکور ہیں اس پر ناراض ہو کر سب شیخ سیوطی پر ٹوٹ پڑے اور انکو کپڑوں سمیت وضو کی جگہ پر اٹھا پھینکا، اس کے بعد علامہ نے اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی، اور قسم کھالی کہ جب تک زندہ رہیں گے مصر میں (خانقاہ بیبرسیہ میں) نہیں رہیں گے، چنانچہ مرتے دم تک روضۂ مقیاس نیل میں سکونت پذیر رہے،[2]

[1] ملاحظہ ہو بدائع الزہور فی وقائع الدہور ج ۳ ص ۳۳۹

[1] لواقح الانوار القدسیہ فی بیان العہود المحمدیہ، مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی، قاہرہ ۱۹۶۱ء ص ۷۱ء

[2] یعنی موصوف نے خانقاہ بیبرسیہ میں صرف رہایش ترک کی تھی، فرائض منصبی ۹۰۶ھ تک انجام دیتے رہے ہیں۔

ان صوفیہ کا جذبۂ انتقام اس سے بھی ٹھنڈا نہ ہوا، وہ برابر ضرر رسانی کے درپے رہے، جب کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو انھوں نے اس گستاخی اور سوء ادبی کی معافی مانگی اور آئندہ کے لیے ان افعال سے توبہ کی، علامہ سیوطی نے انھیں معاف کردیا، اور انھوں نے تحصیل علم کے بہانے موصوف سے تعلقات استوار کرلیے۔ اس کے بعد کچھ اور لوگ علامۂ موصوف کے درپے آزار ہوئے، اس وقت وہ صوفیہ جو علامہ کی محبت وعقیدت کا دم بھرتے تھے ان کی نصرت وحمایت کو کھڑے ہوگئے، علامۂ موصوف ان کے اس جذبۂ ہمدردی سے بہت متاثر ہوئے، آپکے بعض عقیدتمندوں نے آپ سے عرض کیا کہ آپ ارباب کشف میں ہیں، خلیفۂ وقت کے متعلق کوئی ایسی خبر دیجئے کہ وہ لوگ جو ہماری طرح آپ کی بدگوئی اور مخالفت میں مبتلا ہیں، اس خبر کی صداقت کو دیکھکر اپنی حرکتوں سے توبہ کرلیں، علامہ کچھ دیر سر افگندہ رہ کر فرمانے لگے، خلیفۂ وقت جان بلاط کی فلاں مہینے کی فلاں تاریخ کو گردن ماری جائے گی، اس کے بعد فلاں حاکم خلیفہ ہوگا، ان لوگوں نے عرض کیا یہ پیشین گوئی تحریر فرمادیں تاکہ لوگوں کو انکار کی گنجایش نہ رہے، ان کی درخواست پر انھوں نے لکھ دیا، انھوں نے یہ تحریر سلطان وقت کے حضور میں لیجاکر پیش کردی، ملک جان بلاط نے اسکو پڑھتے ہی علامۂ موصوف کی گرفتاری کا حکم دیدیا، اس طرح ان صوفیہ نے علامہ سیوطی کو سخت ترین آزمایش میں ڈال دیا، لیکن ان کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کی اللہ تعالیٰ نے لاج رکھ لی، ورنہ ان نام نہاد صوفیوں نے اس موقع پر ان کی ہلاکت میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی، ان کی یہ پرفریب داستان بھی شیخ عبدالوہاب شعرانی کی زبانی سنیے، وہ فرماتے ہیں:۔

جس شخص نے مجھکو مذکورۂ بالا واقعہ کی خبر دی تھی، اسی کا بیان ہے کہ جب ہم ہر طرح علامہ سیوطی کو تکلیف پہنچانے سے عاجز ہوگئے تو تقریباً دس آدمی ان کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ آپ فرض کیجئے ہم کافر تھے اور اب مسلمان ہوئے ہیں، ہم نے استخارہ

کیا ہے، ہم آپ سے کچھ پڑھنا چاہتے ہیں، شاید ہمارے لیے کچھ خیر کا باعث ہو، اور ہماری اصلاح ہوجائے، ہم ان سے تقریباً ایک سال تک پڑھتے رہے، اور وہ ہم سے احتیاط کرتے رہے، ایک سال کے بعد بعض لوگوں نے ان کو اذیت پہنچائی تو ہم ان کی حمایت کو کھڑے ہوگئے، اور ہم نے شیخ موصوف سے غیر معمولی محبت وعقیدت کا اظہار کیا، اس سے ان کا میلان ہماری طرف ہوگیا، ہم نے ان سے عرض کیا، سیدی! آپ بحمد اللہ ارباب کشف میں سے ہیں، ہمارا مقصد یہ ہے کہ آپ ہمیں والیان امور کے واقعات میں سے کسی واقعہ کی خبر دیجئے تاکہ جب وہ صحیح ثابت ہوجائے تو ہم ان کو بتاسکیں جن کو اس حقیقت کے تسلیم کرنے سے انکار ہے، اور وہ بھی توبہ کرلیں جیسے ہم نے توبہ کی ہے، اور یہ ان کے حق میں بہتر ہوگا، شیخ موصوف کچھ دیر خاموش رہ کر فرمانے لگے، سلطان جان بلاط کی اتوار کے دن، ۲۱ جمادی الاولیٰ[۱] (جمادی الاخری) کو گردن اڑا دیجائیگی، اور اس کے بعد فلاں حاکم بادشاہ بنے گا، انھوں نے اس واقعہ کے متعلق علامہ کی تحریر بھی حاصل کرلی اور اس کو سلطان جان بلاط کے حضور میں پیش کردیا، اور اس خبر کو مصر میں پوری شہرت دی، اس سے مملکت میں شور مچ گیا، سلطان جان بلاط نے حکم دیا کہ شیخ کو میرے سامنے پیش کیا جائے، میں انھیں اپنے قتل سے پہلے قتل کروں گا، چنانچہ علامہ سیوطی کی تلاش شروع ہوئی مگر وہ ۴۰ روز تک روپوش رہے یہانتک کہ سلطان جان بلاط

۱؎ واضح رہے کہ یہاں جمادی الاولیٰ کتابت یا طباعت کی غلطی ہے، صحیح جمادی الاخری ہے، مورخ مصر شیخ محمد ابن ایاس حنفی نے بدائع الزہور ج ۲ ص ۳۰۶ میں بصراحت لکھا ہے کہ ملک عادل طومان بای کا لشکر ۱۱ جمادی الاخری ۹۰۶ھ میں قاہرہ میں داخل ہوا اور تقریباً سات روز کے محاصرہ کے بعد اس نے وہ قلعہ فتح کیا جس میں ملک جان بلاط پناہ گزیں تھا، اور اس کو بحالت قید قتل کیا۔

کی گردن ماردی گئی، اور ایسا ہی ہوا جیسا کہ شیخ موصوف نے فرمایا تھا"۔[1]

علامہ کو اس قسم کے دوست نما دشمنوں سے بڑی بڑی تکلیفیں پہنچیں، مگر انھوں نے ان سے کبھی انتقام نہیں لیا اور علمائے سلف کی طرح ان تکالیف کو بڑے صبر و تحمل سے برداشت کرتے رہے، فرماتے ہیں :۔

مجھے علم محبوب بنایا گیا ہے، اس کے ہر چھوٹے بڑے مسئلہ پر غور کرنا اور اس کے حقائق تک پہنچنا اور دقائق سے آگاہ ہونا اور اس کے اصول کا کھوج لگانا میری طبیعت ثانیہ بن گئی ہے، میرے رونگٹے رونگٹے میں علم رچ بس گیا ہے، مجھے کوتاہ نظر اور جاہلوں سے بڑی تکلیف پہنچی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت علمائے سلف میں بھی جاری رہی ہے کہ دنی الطبع

---

[1] ملاحظہ ہو لواقح الانوار القدسیہ ص ۳۴۰۔ واضح رہے کہ علامہ موصوف نے اور بھی بعض پیشین گوئیاں مصر اور اہل مصر کے متعلق اپنی ایک جداگانہ کتاب میں لکھی تھیں، جن کی صداقت کا اعتراف اس دور کے نامور مورخ ابن ایاس حنفی نے بھی بدائع الزہور (ج ۳ ص ۱۴۰) میں ان الفاظ میں کیا ہے :۔

وقد وقفت علی کتاب تالیف الشیخ جلال الدین السیوطی رحمۃ اللہ علیہ ذکر فیہ ان فی ھذا القرن یبلو والخراب فی سنۃ ثلاث وعشرین وتسعمائۃ ثم یتزاید الامر الی سنۃ خمسین وتسعمائۃ فیقع فیھا فناء عظیم حتی یفنی من اھل مصر نحو النصف وقد ظھرت علامۃ ذالک فی ھذہ السنۃ	شیخ جلال الدین سیوطی کی ایک تالیف میری نظر سے گذری ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ اس صدی ہجری میں مصر میں خون خرابہ کا سلسلہ ۹۲۳ھ شروع ہوگا اور یہ سلسلہ ۹۵۰ھ تک برابر بڑھتا رہے گا اور ایسی بربادی ہوگی کہ کم و بیش نصف اہل مصر اس میں ہلاک ہو جائیں گے۔ اس کے آثار کا ظہور اسی سال ہو گیا ہے۔

اور علم سے بے بہرہ لوگوں سے ان کو بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑی ہیں ...... حضرت ابن عباسؓ نے نافع بن ازرق کے ہاتھوں جو تکلیفیں اٹھائی ہیں، ان سے حدیث و تاریخ کی کتابیں بھری ہوئی ہیں، نافع بن ازرق کے حضرت ابن عباسؓ سے سوالات بسند متصل ہم نے تین کراسوں میں جمع کردیے ہیں اور اس کا بیشتر حصہ الاتقان فی علوم القرآن میں بھی نقل کر دیا ہے۔[1]

اسی وجہ سے علامہ سیوطی فرماتے تھے :۔

ما کان کبیر فی عصر قط الا کان لہ عدو من السفلۃ اذ الاشراف لم تزل تبتلی بالاطراف[2]	جس زمانہ میں بھی کوئی صاحب کمال پیدا ہو گیا، پست درجہ لوگ اسکے دشمن ہو گئے، اور ہمیشہ شرفاء رذیلوں کی وجہ سے آزمائش میں مبتلا رہتے ہیں۔[3]

علامہ کے صبر کا یہ نتیجہ نکلا کہ جن لوگوں نے علامہ کے ساتھ گستاخی کی تھی تا حیات ان کو خوشی میسر نہیں ہوئی، اللہ تعالیٰ نے ان کو نمونۂ عبرت بنا دیا، شیخ عبدالوہاب شعرانی کا بیان ہے ان میں سے ایک شخص کو جو کہتا تھا کہ میں نے سیوطی کے شانہ پر کھڑاؤں ماری تھی، میں نے نہایت ابتر حالت میں دیکھا، افلاس کے باوجود زبان کا چٹخارہ اس پر ایسا غالب تھا کہ وہ سر راہ کھڑا رہتا، اور جس کے ہاتھ میں مرغی یا بط، مٹھائی یا شہد دیکھتا، لے اڑتا اور اس کو گھر لیجا کر کھاتا اور چھپ جاتا، یہانتک کہ لوگ اس سے عاجز آگئے۔[4]

---

[1] ملاحظہ ہو تعریف الفئۃ باجوبۃ الاسئلۃ المائیۃ (الحاوی ج ۱ ص ۳۰۰) نیز سوالات نافع ابن الازرق کے لیے ملاحظہ ہو الاتقان فی علوم القرآن (اردو) طبع نور محمد اصح المطابع کراچی ج ۱ ص ۳۵۶ تا ۳۹۷ [2] فہرس الفہارس والاثبات ج ۱ ص ۴۱۲ [3] واضح رہے کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے تصریح کی ہے کہ عہد صحابہ و تابعین ان باتوں سے پاک تھا [4] ملاحظہ ہو لواقح الانوار القدسیہ ص ۷۱

علامہ سیوطی کی پیشین گوئی کے مطابق جب سلطان جان بلاط کے قتل کے بعد اسکے پائ
ملک عادل طومان بای کے زمانہ میں بھی علامہ کو روپوش رہنا پڑا، کیونکہ اس کو علامہ سے دیر
عداوت تھی، اس نے زمام اقتدار ہاتھ میں آتے ہی ان کو طلب کیا، مگر وہ روپوش ر
جب کوئی سراغ نہ لگا تو اس نے فرائض منصبی سے کوتاہی کو بہانہ بنا کر علامۂ موصوف کو شیخو
کے عہدہ سے برطرف کر دیا، اور خانقاہ بیبرسیہ پر شیخ یس بلبیسی المتوفی ۹۰۹ھ کو ان کی
مامور کیا، مورخ ابن ایاس حنفی کا بیان ہے:

فیہ اختفی شیخنا جلال الدین	اس سال ۹۰۶ھ میں ہمارے شیخ جلال الدین
السیوطی وقد طلبہ لیقتلہ بہ	سیوطی روپوش ہو گئے، کیونکہ سلطان نے
وکان بینہما حظ نفس من حین	نے انھیں طلب کیا تھا، تاکہ موقع پا کر انھیں
کان السلطان العادل فی	قتل کرادے اور ان دونوں میں اس
الدوادار یۃ الکبری وجری	وقت سے چلی آرہی تھی، جب سلطان
بینہما امور شتی یطول شرحہا	عادل دوادار یۂ کبریٰ کے عہدہ پر امور
فلما اختفی قرر السلطان الشیخ	تھا، ان میں بہت سی ایسی باتیں ہوئیں
یس البلبیسی فی مشیخۃ الخانقاہ	جن کا ذکر موجب طوالت ہے، جب شیخ
البیبرسیۃ عوضا عن الجلال	موصوف روپوش ہو گئے تو سلطان نے
السیوطی بحکم صرفہ عنہا[1]	انھیں معزول کر کے شیخ یس بلبیسی
	کا خانقاہ بیبرسیہ کی صدارت کے منصب پر

شاہان ممالیک میں ملک عادل طومان بای جور و ستم اور خونریزی و سفاکی میں اپنی نظیر آپ

[1] بدائع الزہور فی وقائع الدہور ج ۴ ص ۳۹۱ و ۳۹۲

اس کا دور حکمرانی تین ماہ اور چند یوم سے زیادہ نہیں رہا، یہ پوری مدت علامہ موصوف نے روپوشی
میں بسر کی، بدائع الزہور میں ہے:

وکان طومان بای الدوادار	طومان بای دوادار علامۂ موصوف سے ازحد
محطا علیہ فلما تسلطن فیما	تھا، بعد میں جب اس کو اقتدار حاصل ہوا تو
بعد اختفی الشیخ جلال الدین	اس کے دور حکمرانی میں جلال الدین سیوطی
السیوطی فی مدۃ سلطنتہ[1]	کو روپوش ہی رہنا پڑا۔

یہ روپوشی ملک عادل طومان بای کے قتل کے بعد عزلت نشینی میں تبدیل ہو گئی اور علامہ
موصوف پھر ایسے گوشہ نشین ہوئے کہ ۹۰۹ھ میں جب خانقاہ بیبرسیہ کی صدارت دوبارہ
پیش کی گئی تو اس کو قبول نہیں کیا اور تا حیات گوشۂ عزلت سے باہر قدم نہیں رکھا جیسا کہ آگے
[آ]ئے گا۔

شاہان وقت سے تعلقات

علامہ سیوطی کا خاندان دینی اور دنیوی دونوں حیثیتوں سے بڑا ممتاز تھا،
خود موصوف کی پرورش شاہی محل میں ہوئی تھی، اس لیے سلاطین اور امرا سب ان سے واقف تھے،
دربار میں ان کا اثر تھا، سلطان عبدالعزیز متوکل باللہ ثانی جو ۸۸۴ھ میں سریر آرائے خلافت ہوا
بڑا نیک دل، متواضع، ہوشمند، صاحب علم اور اہل علم کا قدر داں تھا۔ مورخ ابن ایاس
حنفی کا بیان ہے:

کفوء للخلافۃ، وافر العقل،	یہ خلافت کا اہل، نہایت دانشمند، صائب الرای،
سدید الرای، لہ اشتغال	علم سے وابستہ، متواضع، ملنسار اور بنی عباس
بالعلم، متواضع، کثیر العشرۃ	میں سب سے بہتر تھا۔

[1] بدائع الزہور ج ۲ ص ۳۳۹

للناس من خیار بنی العباس[1]

علامہ سیوطی اس کے مخدوم زادہ اور اپنے وقت کے نامور عالم تھے، اس لیے انکی قدر کرتا، اور نہایت ادب و احترام سے پیش آتا تھا، موصوف بھی اس کو مولانا، امیر المومنین و خلیفۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و ابن عم، سید المرسلین الامام، المتوکل علی اللہ و اعزبہ الدین[2] کے الفاظ سے یاد کرتے اور دعائیں دیتے تھے، علامہ سیوطی کے کہنے سے مسندین وقت نے خلیفہ کو روایت حدیث کی سند دی، موصوف نے شیوخ وقت کی ان روایات کو جو انھوں نے خلیفہ سے بیان کی تھیں ایک کتاب میں یکجا کردی ہیں، علامہ سیوطی حسن المحاضرہ میں فرماتے ہیں:

واجازلہ باستدعائی جماعۃ من المسندین وقد خرجت لہ عنھم جزأ حدث بہ[3]	میری استدعا پر مسندین وقت نے خلیفہ کو روایت حدیث کی اجازت دی اور ان حدیثوں کو جو انھوں نے ان سے بیان کی تھیں میں نے ایک جزء میں تخریج کردی ہے،

اسی خلیفہ کے لیے علامہ سیوطی نے بنی عباس کے فضائل میں دو کتابیں لکھی تھیں، وہ حسن المحاضرہ میں رقمطراز ہیں:

والفت برسمہ کتاب الاساس فی فضل بنی العباس وکتاب رفع الباس عن بنی العباس[3]	میں نے انہی کے ایماء پر کتاب الاساس فی فضل بنی العباس اور کتاب رفع الباس عن بنی العباس لکھی تھیں،

[1] ملاحظہ ہو بدائع الزہور فی وقائع الدھور، طبع بولاق مصر ج ٢ ص ٣٢٣ [2] کتاب الاعلام بحکم عیسی علیہ السلام یہ رسالہ الحاوی للفتاوی میں شامل ہے" الحاوی للفتاوی ج ٢ ص ١٧٣ [3] حسن المحاضرہ ج ٢ ص ٨٥

متوکل باللہ ثانی فرمائش کرکے ان سے کتابیں لکھواتا تھا، قرآن مجید میں غیر زبانوں کے الفاظ کی تحقیق میں علامہ سیوطی کا جو رسالہ ہے، وہ بھی اسی کے ایماء سے لکھا تھا، اسی لیے وہ المتوکلی کے نام سے موسوم ہے، علامہ جب کسی شاہی تقریب کے موقع پر اس کے دربار میں جاتے تو وہ کسی نادر کتاب سے کوئی نہ کوئی عجیب و غریب سوال دیکھکر ان سے پوچھتا، چنانچہ جب ٨٩٩ھ میں سال نو کی تقریب میں قلعہ میں دربار منعقد ہوا اور اعیان مملکت اور علما، خلیفہ کو سال نو کی مبارکباد دینے وہاں گئے، تو علامہ سیوطی بھی تشریف لے گئے[1]، خلیفہ نے ملاقات کے بعد ان سے سوال کیا کہ ایسا فعل مسنون کونسا ہے جو رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، پھر بھی وہ سنت ہے، علامہ اس وقت تو خاموش رہے، مگر بعد میں اس کا نہایت جامع جواب لکھکر خلیفہ کو بھیجدیا، مورخ ابن ایاس کا بیان ہے:-

پھر جب ٨٩٩ھ شروع ہوا اور محرم میں قاضی سال نو کی مبارکباد پیش کرنے قلعہ شاہی میں پہنچے تو شیخ جلال الدین اسیوطی بھی گئے، جب وہ بیٹھ گئے تو سلطان وقت نے ان سے ایک ایسی سنت کے بارے میں سوال کیا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسنون قرار دیا اور خود نہیں کیا، شیخ جلال الدین سیوطی باایں ہمہ تبحر و وسعت معلومات کوئی جواب نہ دے سکے، سلطان کے پاس ایک کتاب تھی جس کا نام حیرۃ الفقہاء تھا (وہ اس میں سے دیکھکر سوال کیا کرتا تھا) اس کے بعد شیخ جلال الدین نے اس مسئلہ کا نہایت بہتر اور شافی جواب لکھکر بھیجا کہ اس فعل سے مراد اذان ہے۔ اذان آپ نے کبھی نہیں دی ہے پھر بھی وہ سنت ہے۔ اور صحیح واقعہ یہ ہے کہ

[1] ملحوظ خاطر رہے کہ سال نو کی تہنیت اور مبارکبادی کو فقہا نے مباح لکھا ہے، موصوف "التہنیۃ بالفضائل العلیہ و المناقب الدینیۃ" میں حافظ عبد العظیم منذری سے ناقل ہیں:

الہ مباح لیس بسنۃ ولا بدعۃ نقلہ الغزی فی شرح المنہاج ولم یزد علیہ (الحاوی للفتاوی ج ١ ص ٨٣)	یہ امر مباح ہے، نہ سنت ہے، نہ بدعت، علامہ غزی نے شرح المنہاج میں یہی نقل کیا ہے اور اس سے زائد کچھ نہیں لکھا ہے۔

ایک موقع پر آپؐ نے اذان دی ہے جیسا کہ حدیث میں وارد ہے، علامہ نے اس موضوع پر ایک کراسہ لکھا اور اس میں بہت سی وہ باتیں بیان کیں جو مسنون ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کی ہیں[۱]۔

خلیفہ متوکل باللہ ثانی کی نظر میں علامہ سیوطی کی جو قدر و منزلت تھی اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ قاضی القضاۃ (امیر عدلیہ) جیسے اہم اور جلیل القدر منصب پر اس نے انھی کا انتخاب کیا تھا۔

علامہ سیوطی کو جس طرح عباسی خلفاء کے دربار میں اثر و رسوخ حاصل تھا، اسی طرح شاہان چراکسہ اور ممالیک کے دربار میں بھی انھیں اعزاز و اکرام حاصل تھا، ملک اشرف قاتیبای جرکسی سے ان کے بڑے مراسم تھے، علامہ نے تاریخ الخلفاء میں اس کے حج کا واقعہ نقل کیا ہے، اور اس کی داد و دہش کی تعریف کی ہے[۲]۔ جب علامہ سیوطی کو موقع ملتا اس کو نصیحت اور سلطنت کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرتے اور قیام سلطنت کی ترغیب دیتے تھے، ملک اشرف کے لیے علامہ سیوطی نے الاحادیث المنیفہ فی السلطنۃ الشریفہ لکھی تھی جس میں قیام سلطنت کی ترغیب اور اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے متعلق حدیثوں میں جو فضیلتیں آئی ہیں ان کو بیان کیا ہے[۳]۔

سلطان ابو النصر سیف الدین قانصوہ غوری المتوفی ۹۲۲ھ سے بھی جو شعر و ادب کا بڑا دلدادہ اور نہایت شجاع تھا، علامہ کے نہایت خوشگوار تعلقات تھے، اس کے بعض موشحات کی انھوں نے شرح بھی لکھی ہے، جس کا نام النفح الظریف علی الموشح الشریف ہے، اس کے دربار کی علمی مجلسوں میں موصوف بھی شریک ہوتے تھے۔

ایک مرتبہ سلطان قانصوہ غوری کی مجلس میں سبز چادر جسے علماء و مشائخ شانوں پر ڈال لیتے تھے

---

[۱] ملاحظہ ہو تاریخ ابن ایاس، طبع بولاق مصر ۱۳۱۱ھ ج ۲ ص ۲۸۰ [۲] تاریخ الخلفاء طبع قاہرہ ۱۹۵۲ء ص ۵۱۵ [۳] کشف الظنون ج ۱ ص ۱۴

اور جس کو عربی میں طیلسان کہتے ہیں، موضوع بحث بن گئی، یہ چونکہ عجمیوں کا لباس تھا اس لیے بعض علماء نے اس کا استعمال مکروہ کہا ہے، مگر علامہ موصوف نے اس کو مستحب قرار دیا ہے، اس کے ثبوت میں کشف اللسان عن ذم الطیلسان اور الاحادیث الحسان فی فضل الطیلسان نامی دو رسالے لکھے، اول الذکر کے متعلق سید انور شاہ کشمیری فیض الباری میں فرماتے ہیں:

الطیلسان ثوب کان العرب یلقونہ علی رؤسھم وفیہ دلیل علی ان الطیلسان کان من سیماء الیھود فھل یکون مکروھا فحقق السیوطی فی رسالۃ تسمی بکشف اللسان عن ذم لبس الطیلسان استحبابہ وادعی ان الصالحین کانوا یستعملونہ وکتب ان الشیخ ابن الھمام کان یلبسہ[۱]

طیلسان ایک کپڑا (چادر) ہے جو عرب اپنے سروں پر ڈالا کرتے تھے، اس حدیث میں اس امر پر دلیل ہے کہ طیلسان یہود کے ملبوسات کی علامت خصوصی تھی، کیا ایسی صورت میں اس کا استعمال مکروہ ہوگا۔ شیخ جلال الدین سیوطی نے اس موضوع پر ایک رسالہ میں جس کا نام کشف اللسان عن ذم الطیلسان ہے محققانہ کلام کیا ہے، اور اس کو مستحب لکھا ہے، اور یہ دعوی کیا ہے کہ

---

[۱] ملاحظہ ہو فیض الباری ج ۱ ص ۱۴۴، واضح رہے علامہ سیوطی نے بغیۃ الوعاۃ میں محقق ابن ہمام کے تذکرہ میں ان کے استعمال طیلسان کا ذکر کیا ہے، موصوف کے الفاظ ہیں:

کان الشیخ یلازم لبس الطیلسان کما ھو السنۃ ویرخیہ کثیرا علی وجھہ وقت حضور الشیخونیۃ

شیخ ابن ہمام ہمیشہ طیلسان کو اوڑھتے تھے جیسا کہ سنت ہے اور جامعہ شیخونیہ میں حاضری کے وقت اسکو چہرہ پر بہت لٹکا لیتے تھے۔

امرا میں نائب طرابلس وحلب اینال الاشقر امیر کبیر کسبای جو کسی سے بھی موصوف کے خصوصی مراسم تھے، جامع شیخونیہ میں مشیخۃ الحدیث کے منصب پر تقرر میں اس کی مساعی کو بھی بڑا دخل تھا۔

امراء وملوک سے علامہ کے جو مراسم و تعلقات تھے، ان سے خلق خدا کو فائدہ پہنچتا تھا، ۸۹۰ھ میں جب علامہ دنیا چھوڑ کر روضۃ المقیاس میں عزلت نشین ہوگئے تو بعض احباب نے عرض کیا ایسا کرنا اسلاف کے طرز عمل کے خلاف ہے، وہ لوگوں کے مفاد کی خاطر شاہان وقت کے یہاں آمد و رفت رکھتے تھے، علامہ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا کہ سلف کا اتباع اور دین کی سلامتی اب ان سے ترک تعلقات میں ہے، اس دعوے کے ثبوت میں انھوں نے ایک رسالہ بھی لکھا ہے جس کا نام ما رواہ الاساطین فی عدم التردد الی السلاطین ہے، حافظ سید مرتضیٰ بلگرامی نے اتحاف السادۃ المتقین بشرح احیاء علوم الدین میں شاہان وقت سے اجتناب کے ثبوت میں اس رسالہ سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے[1]، محدث نجم الدین غزی نے الکواکب السائرہ میں بصراحت لکھا ہے، کہ میں نے اس کتاب کو نظم کا جامہ پہنایا ہے، اور یہ نہایت جامع و لطیف منظومہ ہے، اس میں میرے کچھ اضافے بھی ہیں[2]۔

سیر و سیاحت علامہ سیوطی کو سیر و سیاحت کا بھی شوق تھا، انھوں نے جن ممالک کی سیاحت کی ہے ان میں شام، یمن، حجاز، ہندوستان اور بلاد مغرب سب داخل ہیں، وہ خود حسن المحاضرہ میں رقمطراز ہیں:

سافرت بحمد اللہ تعالیٰ	میں نے بحمد اللہ تعالیٰ بلاد شام، حجاز
الی بلاد الشام والحجاز	یمن، ہندوستان، بلاد مغرب
والیمن والهند والمغرب والتکرور[3]	اور تکرور کی سیاحت کی ہے،

[1] اتحاف السادۃ المتقین ج ۷ ص ۱۲۷ [2] الکواکب السائرہ تذکرہ علامہ سیوطی [3] حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۹۰

افسوس ہے کہ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ علامہ سیوطی نے ان ممالک کی سیاحت کس سنہ میں کی اور نہ یہ پتہ چل سکا کہ ہندوستان میں ان کا ورود کب اور کہاں ہوا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاحت کا زمانہ خلوت نشینی سے قبل ہی کا ہے۔

خلوت گزینی اور یاد الٰہی علامہ سیوطی کی خلوت نشینی کا آغاز تو ۸۹۰ھ میں ہو چکا تھا، لیکن ۹۰۶ھ میں جو حالات پیش آئے ان کی وجہ سے ان کا دل دنیا اور اہل دنیا سے بالکل سرد ہو گیا، اور وہ اپنے گھر میں جو روضۃ المقیاس میں واقع تھا، ایسے خلوت نشین ہوئے کہ مرتے دم تک باہر قدم نہیں نکالا، تصنیف و تالیف کا زیادہ تر کام اسی زمانہ میں ہوا ہے، مورخ نجم الدین غزی المتوفی ۱۰۶۱ھ الکواکب السائرہ میں لکھتے ہیں:

ولما بلغ اربعین سنۃ من عمرہ	جب کارواں عمر چالیسویں منزل میں پہنچا
اخذ فی التجرد للعبادۃ و	تو علامہ خلوت میں بیٹھے، عبادت اور یاد الٰہی
الانقطاع الی اللہ تعالیٰ و	میں ہمہ تن مشغول رہنے لگے، دنیا اور اہل دنیا
الاشتغال بہ صرفا و	سے اس طرح منہ موڑ لیا گویا کبھی ان دنیا داروں
الاعراض عن الدنیا واھلھا	میں سے کسی سے شناسائی ہی نہ تھی اور تصنیف
کانہ لم یعرف احدا منھم	و تالیف کا کام شروع کیا، فتوے لکھنا اور
وشرع فی تحریر مؤلفاتہ وترک	درس دینا چھوڑ دیا، ایک رسالہ بھی عذر خواہی
الافتاء والتدریس واعتذر	کے سلسلہ میں لکھا جس کا نام التنفیس ہے،
عن ذالک فی مؤلف الفہ فی	روضۃ المقیاس میں اقامت پذیر ہوئے
ذالک وسماہ بالتنفیس[1] واقام	اور مرتے دم تک یہاں سے نہیں
فی روضۃ المقیاس فلم یتحول منھا الی ان مات[2]	نکلے۔

[1] اس رسالہ کا پورا نام التنفیس فی الاعتذار عن ترک الافتاء والتدریس ہے [2] الکواکب السائرہ ج ۱ ص ۲۲۸

خلوت نشینی کے دور کی اجازت روایت جن تلامذہ کو حاصل ہو سکی ہے، وہ روضۃ المقیاس میں قرأت وسماعت کے بعد ہوئی ہے، شیخ تاج الدین حنفی مکی کی اوائل العلقمی میں مذکور ہے۔

قال وذکر السنهوری انه سأل العلقمی کیف اخذ تم الجامع عن مولفه قال کنا نذهب مع السید الشریف یوسف الارمیونی الی الروضة فنطرق باب الحافظ السیوطی فان کان السید یوسف معنا فتح الباب والا فلا والسید یوسف یقرأ ونحن نسمع[1]

(حافظ بابلی فرماتے ہیں) سالم سنہوری نے بیان کیا کہ انھوں نے اپنے شیخ علقمی سے دریافت کیا کہ آپ کو علامہ سیوطی سے جامع الصغیر کی سند کیسے ملی (علامہ موصوف تو زمانہ تالیف میں عزلت نشین تھے) علقمی نے فرمایا کہ ہم سید شریف یوسف ارمیونی کے ہمراہ روضۃ المقیاس جاکر حافظ سیوطی کا دروازہ کھٹکھٹاتے، اگر ہمارے ہمراہ سید موصوف ہوتے تو دروازہ کھولا جاتا ورنہ نہیں، سید یوسف قرأت کرتے اور ہم سنتے تھے۔

اس زمانہ میں طالبان حدیث روایت حدیث کی اجازت کے لیے در دولت پر حاضر ہوتے، علامہ انھیں شرف تلمذ بخشتے اور مشہور کتابوں سے کچھ حدیثیں سنکر روایت حدیث کی اجازت سے سرفراز فرماتے تھے، شیخ عبدالوہاب شعرانی کا شمار اسی قسم کے تلامذہ میں ہے، شیخ شعرانی کا بیان ہے

ارسل لی ورقة مع والدی باجازته لی بجمیع مرویاته

(علامہ موصوف نے) میرے والد کے ہاتھ مجھے اپنی تمام مرویات وتالیفات کی اجازت

[1] اوائل العلقمی از قاضی تاج الدین مکی حنفی کی بحوالہ فہرس الفہارس والاثبات ج ۱ ص ۶۳

واجتمعت به مرة واحدة فقرأت علیه بعض احادیث من الکتب الستة وشیأ من المنهاج فی الفقه تبرکا ثم بعد شهر سمعت ناعیه ینعی موته فحضرت الصلوٰة علیه عند الشیخ احمد الابار یقی بالروضة عقب صلوٰة الجمعة[1]

تحریر فرماکر بھیجی، پھر علامہ کی وفات سے کچھ پہلے میں مصر آگیا اور مجھے بھی ایک مرتبہ ہمنشینی کی سعادت حاصل ہوگئی، میں نے علامہ سے صحاح ستہ کی چند حدیثیں اور فقہ میں المنہاج کا کچھ حصہ برکت کی غرض سے پڑھا، اسکے ایک مہینے بعد موت کی خبر کا منادی کرنے والے نے انکی موت کی خبر سنائی، نماز جنازہ میں شرکت کیلیے میں بھی بعد نماز جمعہ شیخ احمد باریقی کے پاس روضہ میں حاضر ہوا۔

اخلاق وعادات علامہ سیوطی زہد وورع، صبر واستقامت اور عفو ودرگذر کے مجسم پیکر اور فضائل اخلاق کی مکمل تصویر تھے۔ وہ نہ دشمنوں سے انتقام لیتے اور نہ دولت کی کوئی حقیقت سمجھتے تھے، شاہان وقت کے تحائف بھی واپس کرنے میں تامل نہ فرماتے تھے، وقار علمی اور عزت نفس کو کسی موقع پر ٹھیس نہ لگنے دیتے تھے۔

عبادت وریاضت عبادت وریاضت اور تقویٰ وطہارت میں درجہ قصویٰ پر فائز تھے، حافظ محمد بن طولون حنفی المتوفی ۹۵۳ھ کا بیان ہے:

کان فی درجة المجتهدین فی العلم والعمل[2]

علم وعمل میں مجتہدین کے مرتبہ ومقام پر فائز تھے۔

اگر تہجد کبھی ناغہ ہو جاتی تو اتنا صدمہ ہوتا کہ بیمار پڑ جاتے تھے، سید انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں:

کتب السیوطی انه کان اذا فاتت عنه التهجد مرض[3]

شیخ سیوطی نے لکھا ہے کہ انکی تہجد اگر رہ جاتی تو مارے صدمہ کے بیمار پڑ جاتے تھے۔

[1] ملاحظہ ہو ذیل الطبقات للشعرانی بحوالہ الامام السیوطی، مطبعہ سلفیہ قاہرہ ۱۳۶۶ھ ص ۸ [2] مفاکهة الخلان فی حوادث الزمان طبع قاہرہ ۱۹۶۲ء ص ۳۰۶ [3] فیض الباری ج ۴ ص ۳۶۶ وشذرات الذهب فی اخبار من ذهب ج ۸ ص ۵۳

استغنا و بے نیازی ایک زمانہ تک علامۂ موصوف کے امراء و ملوک سے مراسم رہے تھے، مگر جب سے ان کو تصوف سے شغف ہوا، استغناء کا وہ مقام حاصل ہوا جو اولیاء اللہ میں بھی کمتر بزرگوں کو حاصل ہو سکا ہے، امراء و عمائد سلطنت ان کے در دولت پر حاضر ہوتے، مگر علامہ اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کرتے، وہ تحفے تحائف پیش کرتے اور علامہ واپس کر دیتے تھے۔

ایک مرتبہ سلطان اشرف قانصوہ غوری نے جس کو علامہ سے بڑی عقیدت تھی خواجہ سرا اور ہزار دینار بھیجے، علامہ نے دینار واپس کر دیے اور خواجہ سرا کو آزاد کر کے روضۂ نبوی میں خادم مقرر کر دیا، اور سلطان کے قاصد سے فرمایا کہ اب کبھی ہمارے پاس تحفے نہ لانا، اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس قسم کے تحفوں سے مستغنی کر دیا ہے۔ سلطان وقت نے کئی مرتبہ ان کو بلوایا مگر وہ ایک مرتبہ بھی نہیں گئے۔

(باقی)

مناقب الاصفیاء

(خانوادۂ فردوسیہ کا قدیم ترین تذکرہ)

از جناب سید شمیم احمد صاحب ڈھاکہ

حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری بہاریؒ اور فردوسیہ سلسلہ کے بزرگوں کے حالات میں عموماً مناقب الاصفیا کا حوالہ دیا جاتا ہے، یہ اس خانوادہ کا قدیم ترین اور نہایت مستند تذکرہ سمجھا جاتا ہے، کیونکہ حضرت مخدوم شاہ شعیب کی تصنیف بتائی جاتی ہے ان کا مزار شیخ پورہ (ضلع مونگیر) بہار میں ہے، آپ مخدوم الملک کے چچازاد بھائی، ہمعصر اور ایک روایت کے اعتبار سے مرید تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مخدوم الملک نے مولانا مظفر بلخی کو وصیت کی تھی، کہ میرا خرقہ، عمامہ اور مقراض "برادرم شعیب[1]" کو پہنچا دیا جائے، مولانا مظفر کو اس کا خیال نہ رہا، یہاں تک کہ ان کا وصال ہو گیا، شیخ حسین سجادہ نشین ہوئے تو انھوں نے مخدوم الملک کو خواب میں دیکھا، وہ کہہ رہے ہیں "برادرم شعیب" کو انکی امانت جلد پہنچا دو، اس ہدایت کے مطابق شیخ حسین نے سب چیزیں اپنے صاحبزادے شیخ حسن بلخی کے ہاتھ بھیجدیں، ادھر شیخ حسن چلے اُدھر "باشراق باطن" دریافت کر کے حضرت شعیب بہار تشریف روانہ ہوئے، دونوں بزرگوں کی ملاقات راستے میں ہوئی، شیخ حسن نے اپنے والد کی طرف سے معذرت کے بعد تمام چیزیں حوالہ کیں۔ حضرت شعیب نے یہ تبرکات شوق اور عقیدت و احترام کے ساتھ قبول فرمائے۔ اور حضرت حسن بلخی سے اصرار کیا کہ آپ بھی مجھے خلافت سے نوازیں۔

[1] وسیلہ شرف ص ۲۷،

حضرت کمسن تھے، اس فرمایش سے بہت منفعل ہوئے، لیکن حضرت شعیب نہ مانے، کہنے لگے آپ کے والد نے آپ کو میری تنظیم کا حکم دیا ہے، اس لیے میری خواہش پوری کیجئے۔ اس اصرار پر حضرت حسن مجبور ہو گئے، اور شرمندگی کے ساتھ خلافت عطا کی۔ دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت شعیب بیعت بھی شیخ حسن ہی سے تھے، یہ تفصیل وسیلۂ شرف[1] میں ایک رسالہ اور خاندانی روایات کی بنیاد پر لکھی گئی ہے، حال ہی میں شیخ پورہ (بہار) سے مناقب الشعیب کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے، اس میں بھی یہی روایات درج ہیں، مخدوم الملک سے حضرت شعیب کے دو شجرے رائج ہیں، ایک تو براہ راست اور دوسرا حضرت حسن بلخی کے توسط سے یعنی حضرت شعیب کو شیخ حسن سے، شیخ حسن کو شیخ حسین سے، انھیں مولانا مظفر بلخی سے اور مولانا مظفر بلخی کو مخدوم الملک سے اجازت وخلافت ملی، اس روحانی تعلق کے ماسوا مخدوم الملک اور شاہ شعیب کا خاندانی تعلق اس طرح ہے۔ مخدوم الملک بن مخدوم یحیٰی بن مخدوم اسرائیل بن حضرت امام تاج فقیہ اور مخدوم شاہ شعیب بن مخدوم جلال بن مخدوم عبد العزیز بن حضرت امام تاج فقیہ۔ مخدوم الملک کی ایک خالہ کی شادی شاہ مخدوم شعیب کے حقیقی چچا حضرت مخدوم سلیمان لنگر زمین سے ہوئی تھی، غرض حضرت مخدوم شاہ شعیب کی حیثیت کئی طرح سے اہم ہے، آپ نے مخدوم الملک سے لیکر شیخ حسین بلخی کا ابتدائی دور تک دیکھا۔ چونکہ مناقب الاصفیاء کو آپ سے منسوب کیا جاتا ہے، اس لیے اس کتاب کی قدامت واہمیت مسلّم ہے۔

اس کی گذشتہ ستر اسّی سال سے بڑی شہرت ہے، اس کے قلمی نسخے مختلف خانقاہوں اور سجادگان کے یہاں ملتے ہیں، پہلی بار یہ کتاب پنجم ماہ صفر ۱۳۱۳ھ مطابق ۲۸ جولائی ۱۸۹۵ء کو مطبع "نور الآفاق" کلکتہ سے، مولوی سید اقبال علی کے حسب فرمائش محمد بشیر نام کے کسی

[1] وسیلۂ شرف ص ۲۶ تا ۲۹

شخص کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ کاتب کا نام محمد ہدایت اللہ مظفر پوری درج ہے، حاشیے پر جگہ جگہ عربی عبارتوں کا فارسی ترجمہ بحر بہاری کا ہے۔ حاشیے ہی پر بحر بہاری کی دو نظمیں بھی ہیں، ایک مخدوم الملک کی مدح میں، دوسری مولانا مظفر بہاری کے شان میں۔ بحر بہاری نے قطعۂ تاریخ طبع بھی کہا ہے:

بے مثال اندر تصوف نسخۂ	طبع گشتہ چوں ز جہد ایں گدا
بحر بر دم سر بجیب فکر سال	گفت ملہم بحر فیض الاصفیاء ۱۳۱۳ھ

دوسرا قطعۂ تاریخ محمد بشیر صاحب کا کہا ہوا درج ہے۔

چوں مناقب اصفیاء مطبوع شد	ذکر پیران طریقت اہتدا
مصرعِ تاریخ آں گویم بشیر	مصدر عرفان و اسرار علیٰ ۱۳۱۳ھ

کتاب زیادہ ضخیم نہیں ہے، معارف کے سائز میں کل ۱۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

مناقب الاصفیاء کے مطبوعہ و قلمی نسخے میں ایک جگہ تھوڑا سا فرق ہو گیا ہے، شاہ فرزند علی صوفی منیری نے ۱۳۱۳ھ میں مخدوم الملک اور پیران سلسلۂ فردوسیہ کے حالات میں وسیلۂ شرف[1] تالیف کی، اس میں انھوں نے مناقب الاصفیاء کے قلمی نسخے سے اس حصہ کا بھی ترجمہ کر دیا ہے جو مخدوم الملک سے متعلق ہے، اس ترجمہ کی عبارت ایک جگہ یہ ہے "جس زمانہ میں سنارگاؤں میں علم میں مشغول تھے، ایک بیماری عارض ہو گئی تھی، وہاں طبیبوں نے کہا کہ اس مرض کی دوا جماع ہے، دفع مرض کے لیے ایک جاریہ رکھی، اس جاریہ سے ایک بیٹا ہوا" فارسی کے مطبوعہ نسخہ میں جاریہ کے بجائے "نکاح کرد" ہے۔ اصل عبارت یہ ہے:

درانچہ در سنارگاؤں در علم مشغول بود، مرض حادث شدہ بود اطبائے آں مقام

[1] وسیلۂ شرف ص ۱۲ (تیسرا اڈیشن مطبوعہ چاٹگام)

گفتند دوائے ایں مرض جماع است برائے دفع مرض نکاح[1] کرد آزاں یک پسر شد"

شروع کے دس صفحات تمہید سبب تالیف اور مقدمہ پر مشتمل ہیں، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر مولانا مظفر بلخی تک ان سب بزرگوں کا ذکر ہے، جن کا نام شجرہ[2] میں آتا ہے۔

مولف نے اپنے خانوادہ کے پیروں کے ساتھ مبالغہ کی حد تک عقیدت کا اظہار کیا ہے، لکھتے ہیں:

"پیران ایں شجرہ مبارکہ از جمیع مشائخ روئے زمین متمیز اند و روش ایں صدیقان را روش جملہ مشائخ خانوادہ دیگر از صلحاء و زہاد و عباد ممتاز است و کلمات ایں مشائخ را در طور عشق و محبت و توحید و معرفت علوے است کہ کلمات دیگراں بہ لطافت آں نمی رسد فی الجملہ ایں شجرہ طیبہ رنگے دارد کہ غیر او ندارد ...."[3]

جہاں تک واقعات اور ان سے متعلق تاریخ و سنال کا تعلق ہے مولف نے احتیاط سے کام لینے کی کوشش کی ہے، جہاں اختلاف ہے وہاں اس کا بھی ذکر کر دیا ہے، مناقب الاصفیا کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مولف نے محنت اور دیدہ ریزی سے کام لیا ہے۔ حضرت فریدالدین عطار[4] کی تذکرۃ الاولیا، حضرت علی ہجویری داتا گنج بخش کی کشف المحجوب[5] خواجہ غریب نواز کے ملفوظ دلیل العارفین[6] مرتبہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، راحت القلوب[7] ملفوظ حضرت فرید گنج شکر فوائد الفواد[8] اور سراج العارفین، ملفوظات حضرت نظام الدین اولیا، خیر المجالس[9] حضرت نصیر الدین چراغ دہلی، اور سیر الاولیا[10] مرتبہ امیر خورد وغیرہ کا پورا مطالعہ کیا ہے، اس کے علاوہ امام غزالی، قاضی عین القضاۃ، محی الدین ابن عربی، امام نووی، حضرت ابو نجیب ابوالقاہر سہروردی

[1] مناقب الاصفیا، ص ۱۳۲ [2] شجرہ فردوسیہ کے لیے مناقب الاصفیا کے علاوہ ذریعہ دولت ص ۲۳۹ اور تاریخ سلسلہ فردوسیہ (از حسین در دائی) ص ۱۱۵ ملاحظہ ہو [3] مناقب الاصفیا ص ۴ [4] ایضاً ص ۸، ۷۴، ۸۴، ۸۵ [5] ایضاً ص ۱۲
[6] ایضاً ص ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰ [7] ایضاً ص ۹۰، ۹۸، ۱۱۷، ۱۱۹، ۱۲۰ [8] ایضاً ص ۱۲۱ [9] ایضاً ص ۱۱۶، ۱۲۰ [10] ایضاً ص ۱۰۱

شیخ الشیوخ خواجہ شہاب الدین سہروردی کی تصانیف اور فریدالدین عطار، مولانا روم، شیخ سعدی اور دوسرے علما، و مشائخ اور شعرا کے کلام سے بھی استفادہ کیا ہے، مخدوم الملک اور مولانا مظفر بلخی کے حالات مرتب کرنے میں مخدوم الملک کے مکتوبات[1]، معدن المعانی[2]، اجوبہ کاکوریہ[3]، وصیت نامہ[4] (۱) برہان الاتقیا[5] (۳) شیخ حسین بلخی کی تصانیف[6] اور (۴) شیخ حسن بن شیخ حسین کے رسالہ لطیف المعانی[7] کے حوالے دئے ہیں۔

تذکرۃ الاولیا سے استفادہ | مناقب الاصفیا میں ہر بزرگ کا ذکر ابتداءً تذکرۃ الاولیا کے طرز پر کیا گیا ہے، دونوں تذکروں سے کچھ نمونے پیش کیے جاتے ہیں، حضرت فریدالدین عطار نے تذکرۃ الاولیا میں امام جعفر صادق اور حضرت جنید بغدادی کا تعارف اس طرح کرایا ہے۔

"ذکر امام جعفر صادق[8] رضی اللہ عنہ، آں سلطان ملت مصطفوی آں برہان حجت نبوی آں عامل صدیق آں عالم تحقیق آں میوہ دل اولیا آں جگر گوشہ سید انبیا آں ناقد علی آں وارث نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام آں عارف عاشق ابو محمد امام جعفر رضی اللہ عنہ"

ذکر خواجہ جنید[9] بغدادی :- "آں شیخ علی الاطلاق آں قطب باستحقاق آں منبع اسرار آں مرقع انوار آں سبق بردہ باستادے سلطان طریقت و ارشاد جنید بغدادی شیخ الشیوخ عالم بود و امام ائمہ جہاں ...."

مناقب الاصفیا میں بھی یہی روش اختیار کی ہے، دونوں بزرگوں کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے۔

ذکر امام جعفر صادق[10] رضی اللہ عنہ :- آں عمدۂ اولیا آں زبدۂ اصفیا آں مقبول با امامت آں مقیم مقام استقامت آں ثمرہ شجرہ رسالت آں شعبہ دوحہ کرامت آں کوکب سماء عز و جلال

[1] مناقب الاصفیا ص ۸، ۱۴۲ [2] ایضاً ص ۱۴۵ [3] ایضاً ص ۱۴۴ [4] ایضاً ص ۱۴۶ [5] ایضاً ص ۱۰۱، ۱۱۱، ۱۱۷، ۱۲۱
[6] ایضاً ص ۶۲، ۹۳، ۹۷، ۱۳۶ [7] ایضاً ص ۶۱ [8] تذکرۃ الاولیا مطبوعہ مطبع محمدی بمبئی ۱۲۸۳ھ ص ۹ [9] ایضاً ص ۳۹۹ [10] مناقب الاصفیا ص ۵۶

آں فرید بحر سیادت و کمال آں معدن حکمت ربانی آں ساکن کعبۂ سبحانی آں بلبل جلیل نبیل خلفائے
خاندان آں سلالۂ جلیل کرام دودمان آں استاد حاذق ابو محمد جعفر صادق رضی اللہ عنہ۔

سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے: "آں بانی مبانی مقرب
آں مجتہد اوضاع طریق رہنمائے آں واعظ خلائق آں ناطق بحقائق آں سایح فلوات عشق
و محبت آں سایح بحار توحید و معرفت آں قطب بالاتفاق آں شیخ علی الاطلاق آں
ماہر فنون شیخی و استادی خواجہ ابو القاسم جنید بن محمد بغدادی نور اللہ مرقدہ شیخ المشائخ
عالم و امام متفق علیہ بود تا اہل تصوف اورا سید الطائفہ گفتند و شیخ المشائخ نوشتند"[1]

گو انداز تعارف تذکرۃ الاولیا کا ضرور ہے لیکن محض تقلید یا نقالی نہیں ہے، بلکہ مولف
نے اس طرز سے فائدہ اٹھایا ہے، اور اس رنگ کو اور نکھارنے کی کوشش کی ہے بعض ٹکڑے
ادب و انشاء کا بہترین نمونہ ہیں حضرت امام حسین علیہ السلام کے حال میں لکھتے ہیں:

ذکر حضرت امام حسین[2] علیہ السلام :- آں نگین خاتم نبوت آں دُر دریائے کرم و فتوت
آں سید جوانان جناں آں یکے از دو لولو و مرجان آں سر دفتر شہیدا قتیل اللہ
آں سر لشکر مبتلاء سبیل اللہ آں مخزن اسرار محبت آں راز دار بلایائے حضرت آں
ہمائے فضائے محبت و شہباز عشق آں سیمرغ قاف معرفت و مقتول تیغ ناز عشق
آں گل گلشن ریحان چمن رسالت آں مبتلا و حریق نار ولا امیر المومنین حسین شہید
دشت کربلا ...."

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک نمبر ۱۱ سے نمبر ۳۱ صفحے تک رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کے حالات ہیں، لیکن یہاں بھی تاریخی حقائق سے زیادہ غلو سے کام لیا گیا ہے، نہر ساوہ کے
خشک ہو جانے، ایوان کسریٰ کے چودہ کنگرے گر پڑنے، آتشکدۂ ایران کے سرد ہو جانے وغیرہ

۱ مناقب الاصفیا ص ۴۴، ۲ ایضاً ص ۴۱

کا ذکر خاص طور سے کیا گیا ہے، بعض واقعات میں مؤلف نے حوالہ بھی دیا ہے، مگر کسی مورخ یا
محدث کی بجائے ایسے علماء کا جن کی شہرت حلقۂ مشائخ میں زیادہ ہے، مؤلف نے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی ولادت کی تاریخ "دوشنبہ ہشتم[1] ماہ ربیع الاول" لکھی ہے، لیکن کسی تاریخ، سیرت یا
حدیث کی کتاب کا حوالہ نہیں دیا ہے، بعض مسلّم واقعات کے خلاف روایتیں لکھی ہیں، مثلاً
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے چند ماہ قبل ہی آپ کے والد حضرت عبد اللہؓ کا انتقال
ہو چکا تھا، لیکن صاحب مناقب الاصفیا لکھتے ہیں:

"محمد مصطفےٰ علیہ السلام بدو سال و چہار ماہ رسیدہ بود کہ عبد اللہ[2] پدر وے در مدینہ بیمار گشت و
وفات یافت و بروایتے ہفت ماہہ بود و بروایتے دو ماہہ"

ایک جگہ لکھا ہے کہ رسول اللہؐ نے ایک بار خدا تعالیٰ سے دعا کی کہ آپ کی والدہ حضرت آمنہ
زندہ ہو جائیں اور ایمان لے آئیں، خدا نے دعا قبول کی، اس حدیث کا راوی حضرت عائشہؓ
کو لکھا ہے،

"پیغامبر[3] علیہ السلام محزوں در حجون فرود آمد و مدتے در آنجا بماند پس مسرور باز گشت
و گفت از خدائے خواستم کہ مادر من زندہ گرداند پس زندہ گردانید و او بمن ایمان آورد پس باز
بمیرانیدش۔ شیخ محی الدین نووی رحمہ اللہ در کتاب تہذیب الاسماء و اللغات بوضع
و افترائے ایں حدیث تصریح کردہ و گفتہ کہ واضع ایں حدیث قلیل الفہم و عدیم العلم بود"

امام نووی نے اس حدیث کی تردید میں جو دلائل لکھے ہیں مؤلف نے ان کو نقل کیا ہے، اس کے باوجود
خود اس کا اعتقاد یہی ہے حضرت آمنہ دوبارہ زندہ ہو کر اسلام لائیں، لکھتے ہیں

"عجب نیست کہ پیغامبر علیہ السلام از حجون دعا کردہ[4] باشد تا در الوا مادر او را زندہ گردانیدہ و
حجت شدہ باشد"

۱ مناقب الاصفیا ص ۱۱، ۲ ایضاً ص ۱۳، ۳ ایضاً ص ۱۴، ۴ ایضاً ص ۱۵

مخدوم الملک کا ذکر اس کتاب کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں مخدوم الملک شیخ شرف الدین بہاری کا ذکر ہے۔ مخدوم الملک کے حال میں یہ کتاب سب سے قدیم اور معتبر ماخذ سمجھی جاتی ہے، اور آپ کے حالات میں جو کچھ بھی لکھا جاتا ہے اس میں اس کتاب سے ضرور استفادہ کیا جاتا ہے، مناقب الاصفیا میں مخدوم الملک کی ولادت، بچپن، تحصیل علم کے لیے مولانا اشرف الدین توامہ کے ساتھ سنار گاؤں کا اور پیر کی تلاش میں دہلی کا سفر، حضرت نجیب الدین فردوسی سے بیعت، واپسی میں عالم جذب طاری ہونا، جنگلوں میں عبادت و ریاضت، سلوک کی منزل، بہار شریف میں قیام، رشد و ہدایت اور وفات کے حالات درج ہیں[۱]۔ واقعات کے تذکرے میں مصنف نے تاریخ و سال اور افراد کے ناموں میں احتیاط سے کام لیا ہے، معلومات سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی ہے، اس سے معلومات میں کمی ضرور محسوس ہوتی ہے، مگر غلطی کا امکان نہیں رہتا، انداز بیان یہ ہے:۔

"شیخ یحییٰ پدر شیخ شرف الدین منیری[۲] بر مولانا تقی الدین عربی ساکن خطہ مہسون صاحب ملتقط احیاے علوم اعتقاد داشت شاید ارادت ہم بر مولانائے مذکور بودہ باشد۔"

"پدر مادر شیخ شرف الدین منیری مردے بزرگ بود قاضی شہاب الدین[۳] نام داشت۔"

"ساعت[۴] چوں بہ بلاغت رسید در تعلیم علم دین مشغول شد۔"

"آں وقت[۵] ولایت بنگالہ در ضبط بادشاہ دہلی بود۔"

"مدتے[۶] در صحبت و خدمت مولانائے مذکور ماند۔"

"بعدہ ملاقات بشیخ[۷] نظام الدین رحمۃ اللہ کرد در مجلس ایشان چیزے مذاکرۂ علمی بو

۱ مناقب الاصفیا ص ۱۲۷ ۲ وسیلۂ شرف ص ۹۴ ۳ مناقب الاصفیا ص ۱۳۰ ۴ ایضاً ص ۱۳۱
۵،۶ ایضاً ص ۱۳۱ ۷ ایضاً ص ۱۳۱ ۸ ایضاً ص ۱۳۲

جوابہاے پسندیدہ گفت شیخ نظام الدین اعزاز و اکرام فرمودند و یک طبق تنبول دادند و گفتند سیمرغیست نصیب دام ما نیست۔"

"در پانی پت رفت ملاقات بشیخ[۱] شرف الدین پانی پتی کرد گفت شیخ است اما مغلوب حال است بتربیت دیگرے نمی پردازد۔"

مولف نے مخدوم الملک کا تعارف بھی بہت حسین پیرایہ میں کرایا ہے:۔

"آں مجرد[۲] بہ تجرید توحید آں مفرد بتصحیح تفرید آں مبین دقائق مناہج طریقت آں مظہر معانی حقیقت آں صاحب صفا آں مرد خدا آں ساکن لجۂ احدیت آں متمکن مقام زوجیت آں مبارز میادین مجاہدہ آں مالک ممالک کشف و مشاہدہ آں سیمرغ قاف یقین آں ہماے ہمت اہل تمکین آں داؤد تخت خلافت آں سلیمان ملک محبت و معرفت آں واقف اسرار ہدایت و رہبری شیخ جہاں شرف الدین احمد یحییٰ منیری........"

مخدوم الملک کے سلسلہ میں مناقب الاصفیا میں جو حالات درج ہیں اور جس انداز سے لکھے گئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ مخدوم شاہ شعیب کو حضرت مخدوم الملک کے ابتدائی خاندانی حالات کا زیادہ علم نہ تھا، حالانکہ آپ کے چچا زاد بھائی ہوتے تھے، وصال کا سال بھی حضرت زین بدر عربی کے مرتب کردہ وصیت نامہ سے نقل کیا ہے۔

تالیف کا زمانہ کتاب میں کہیں سال تالیف درج نہیں ہے، اور نہ کسی اور ذریعہ سے کوئی اشارہ ملتا ہے، موجودہ صدی کے قبل کی تصانیف میں کہیں بھی مناقب الاصفیا کا حوالہ یا ذکر نہیں ملتا، مولف نے مولانا مظفر بلخی کی رحلت کا ذکر تو کیا ہے، مگر سال وفات نہیں

۱ مناقب الاصفیا ص ۱۳۲ ۲ ایضاً ص ۱۲۷

لکھا ہے، مولانا مظفر بلخی کا وصال کب ہوا اس کا صحیح اندازہ ہمیں ان خطوط سے ملتا ہے جو پروفیسر سید حسن عسکری (پٹنہ) نے چند سال قبل دریافت کیے ہیں، یہ خطوط[1] بنگال کے سلطان غیاث الدین اعظم شاہ کے نام ہیں، مولانا کے ایک خط سے پتہ چلتا ہے کہ مخدوم الملک اور سلطان کے والد سلطان سکندر شاہ کے درمیان بھی سلسلہ مکاتبت قائم رہا، ایک خط میں مولانا مظفر نے سلطان کو لکھا تھا کہ وہ فقرا کی ایک جماعت کے ساتھ حج کو جانے والے ہیں، اس لیے چاٹگام کی بندرگاہ سے جانے والے پہلے جہاز میں ان کے لیے انتظام کر دیا جائے، چنانچہ اس نے ان کا انتظام کر دیا، دوسرے خط میں مولانا نے اس کا شکریہ ادا کیا ہے، اور اس کے لیے دعائے خیر کی ہے، سکندر شاہ اور اعظم شاہ کا عہد[2] علی الترتیب سنہ ۷۵۹ھ - سنہ ۷۹۲ھ اور سنہ ۷۹۴ھ - سنہ ۸۱۳ھ ہے، لہٰذا مظفر بلخی کا سال وفات بہر حال سنہ ۷۹۴ھ کے بعد ہے، اس کے بعد مناقب الاصفیا میں شیخ حسین بلخی کی تالیفات گنج لایخفیٰ، رسالہ جواہر السلوک اور رسالہ در نسب پیغمبر علیہ السلام کے حوالے درج ہیں، جس میں شیخ حسین کے صاحبزادے حضرت شیخ حسن بلخی کے رسالہ لطیف المعانی کا بھی ذکر ہے، مناقب الاصفیا میں سید السادات[3] ظہیر کو مرحوم لکھا ہے، حضرت سید ظہیر[4] کے نام مولانا مظفر بلخی کے خطوط ملتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب نویں صدی ہجری میں مرتب کی گئی ہے۔

کتاب کا مولف بعض لوگوں کو شبہ ہے کہ یہ کتاب مخدوم شاہ شعیب کی تالیف ہے، بعض وجوہ سے اس شبہ کو تقویت ملتی ہے، مولف نے کہیں اپنا نام نہیں لکھا ہے، اور نہ کسی پرانی تصنیف سے کوئی ثبوت ملتا ہے، مخدوم الملک کے خاندانی حالات نہایت مختصر اور غیر واضح ہیں، "مناقب الاصفیا"

[1] جرنل آف دی بہار ریسرچ سوسائٹی حصہ دوم سنہ ۱۹۵۷ء ص ۱ تا ۱۹ [2] سوشل ہسٹری آف دی مسلمز ان بنگال (از ڈاکٹر عبد الکریم ڈھاکہ) ص ۲۷، ۲۸ ـ کارپس آف دی مسلمز کوائنس ان بنگال (از عبد الکریم) ص ۴۹، ۵۸

[3] مناقب الاصفیا ص ۵ [4] تاریخ سلسلہ فردوسیہ معین الدین دردائی ص ۲۷۸

سے پتہ چلتا ہے کہ مولف کو مخدوم الملک سے فیض اٹھانے کا کبھی موقع نہیں ملا تھا، اور یہ کتاب اس وقت لکھی گئی جب شیخ حسن بلخی کی لطیف المعانی مرتب ہو چکی تھی، جو مخدوم شعیب متوفی سنہ ۸۲۴ھ کے بعد کی کتاب ہے، مناقب الاصفیا سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت حسین بلخی کے کسی مرید کی تالیف ہے کتاب کے آغاز ہی میں مولف فرماتے ہیں کہ

"اما بعد چوں شجرہ[1] پیران بندگی مخدوم شیخ الاسلام والمسلمین برہان الحق والحقیقت والدین شیخ حسین معز شمس بلخی متع اللہ المومنین بطول بقائہ وادام علیہم نعمۃ بقایہ کہ سبب و دلیل، ہدایت مرید الست ۔۔۔۔۔۔"

اگر مخدوم شعیب کی تالیف ہوتی تو شیخ حسین بلخی کی بجائے مخدوم الملک کو بنیاد بنا کر تمام بزرگوں کا ذکر کیا جاتا، کیونکہ حضرت شعیب مخدوم الملک کے بھائی اور ہمعصر ہونے کے علاوہ مرید بھی تھے، اگر مناقب الاصفیا، واقعی مخدوم شعیب کی تالیف ہے تو وصال کا سال سنہ ۸۲۴ھ[2] غلط معلوم ہوتا ہے، اور یہ روایت محض افسانہ معلوم ہوتی ہے، کہ مخدوم الملک نے مولانا مظفر بلخی کو وصیت کی تھی کہ برادرم شعیب کو میرا عمامہ و خرقہ بھجوا دینا، اس کی بجائے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ مخدوم شعیب کو ارادت شیخ حسین بلخی سے، اور خلافت و اجازت شیخ حسن بلخی سے حاصل تھی، بہر حال مناقب الاصفیا قابل قدر کتاب ہے، فردوسیہ سلسلہ کے مشائخ خصوصاً مخدوم الملک اور مولانا مظفر بلخی کے حالات میں یہ ایک مستند و قدیم ترین تذکرہ ہے۔

[1] مناقب الاصفیا ص ۲

[2] سیرۃ الشرف ص ۲۹

ادبیات

جشن شبلی

از جناب یحییٰ اعظمی

دیدنی آج ہے دانش گہِ شبلی کا وقار — نظر افروز ہے گلزارِ معارف کی بہار

غیرتِ باغِ ارم ہے چمنستانِ حکم — نازشِ خلدِ بہاراں ہے بہشتِ اسرار

آئے ہیں دہر کے اربابِ نظر بہرِ طواف — بن گیا کعبۂ فن علم و معارف کا دیار

اللہ اللہ یہ رعنائی بزمِ شبلی — آج فردوسِ نظر ہے یہ حریمِ افکار

جس کے ہر گوشہ میں ہے شاہدِ فن جلوہ نشیں — جس کے ہر ذرہ میں ہیں مہرِ یقیں کے انوار

جس طرف دیکھیے ہیں لولوے لالائے ہنر — اس نوازش سے ہو نیسانِ حکم گوہر بار

ایک جانب ہیں عروسانِ معانی کی صفیں — اک طرف پردہ نشینانِ معارف کی قطار

وہ کتب خانۂ حکمت وہ حریمِ سیرت — نقش ہے جس کے صحیفوں میں حیاتِ سرکار

کیوں نہ ہو مہبطِ انوار کہ ہے دفن یہیں — سیرتِ سرورِ کونین کا اعجاز نگار

کلکِ استاذ کا وہ اصل ہو اک حسنِ طراز — خاتمِ دہرِ سلیماں کا ہر اک نقش و نگار

جس کا ہر حرف ہو سرمایۂ تاریخ و ادب — جس کا ہر لفظ ہو تحقیق و ہنر کا شہکار

دفترِ فکر و نظر جس کے معارف پہ فدا — گوہرِ شعر و ادب جس کے صحائف پہ نثار

تہنیت سنج ہیں اس ذوق سے اربابِ کمال — گونج اٹھا نغمۂ تبریک سے شبلی کا دیار

ہے جو مرقد کے قریں جشنِ معارف برپا — شورِ احسنت بلند است ز بالینِ مزار

جمع ہیں آج جو اس بزم میں اصحابِ کمال
دیکھنے آئے ہیں سب محفلِ شبلی کا جمال

یہ گلستانِ معارف یہ خیابانِ نظر — دیدہ ور کے لیے لاریب تھا شایانِ نظر

عہدِ حاضر کا یہ دانش کدۂ علم و کمال — ہے بجا آج جو ہے مرجعِ اعیانِ نظر

باز ہیں چار طرف فکر و نظر کے دفتر — عصرِ حاضر میں کہاں یہ سر و سامانِ نظر

شبلی و سید مرحوم کا گہوارۂ فن — ادبستانِ معانی و دبستانِ نظر

وہ ریاضِ ہنر و گل کدۂ دانش و دیں — جس کے پھولوں کے لیے تنگ ہے دامانِ نظر

آج ہو سارے جہاں کے لیے جو علم نواز — ہے یہ کس نامورِ دہر کا فیضانِ نظر

جس کی تخلیق حقیقت میں ہو معراجِ کمال — جس کی تحقیق ہے ایمانِ نظر جانِ نظر

جس کی تالیف کو مطلوب ہو دانائی راز — جس کی تصنیف کو درکار ہو امعانِ نظر

فرض ہو جس کے ہنر کے لیے آگاہی فن — شرط ہو جس کے نظر کے لیے عرفانِ نظر

زندہ ہیں آج بھی اے سیدِ فردوس نشیں — تیرے اصحابِ ہنر تیرے رفیقانِ نظر

جن کے دم سے ہو تر و تازہ معارف کی بہار — جن سے آتی ہو ابھی نکہتِ دامانِ نظر

للہ الحمد ہو اب تک وہ حیاتِ مسعود — فیض سے جس کے ہو معمورہ یہ ایوانِ نظر

ہے اسی شان سے یہ مجلسِ دانش قائم — کار فرما ہے جو فیضانِ سلیمانِ نظر

اے خوشا دہر کا وہ میکدۂ علم و یقیں — مرحبا شہرِ معارف کا خمستانِ نظر

جس کے ہر جرعہ سے خوش کام ہیں خاصانِ کمال — جس کے ہر جام سے سرشار ہیں اعیانِ نظر

فیضِ میخانہ ہو جو نصف صدی سے جاری — پئے تبریک یہاں جمع ہیں رندانِ نظر

ہو مبارک اسے یہ فکر و نظر کی تقریب
ہو مبارک اسے یہ جشنِ ہنر کی تقریب

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

مقام اشاعت	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	صدیق احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	" "
قومیت	....
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام اڈیٹر	شاہ معین الدین احمد ندوی
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	" "

میں صدیق احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

صدیق احمد

جلد ۹۵ - ماہ ذو الحجہ ۱۳۸۴ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۶۵ء - نمبر ۴

مضامین